معارف

اگست ۲۰۲۰ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

☽ (Ma'arif Section) 06386324437

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۶ ماہ ذی الحجہ ۱۴۴۱ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۲۰ء عدد ۲

فہرست مضامین

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار ناممکنات سے ہے، قریب یہی حال امراض و مصائب کا بھی ہے جن کا علاج بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں ہی میں شمار ہوتا ہے لیکن درد جب لا دوا ہو تو پھر عارضہ کو عذاب ہی کہنا چاہیے، کورونا کے عذاب کا ذکر شذرات میں کئی مہینوں سے مسلسل ہوتا آیا ہے، امراض کا ستم عموماً ہر ظلم کی طرح ان کو سہنا ہوتا ہے جو غریب ہوں، نادار اور بے سہارا ہوں لیکن کورونا نے جس طرح اپنے تباہ کن اثرات کو عام کیا اس کی توجیہہ بھی اسی قدر عام ہوئی، جسم انسانی کے ساتھ ساتھ سیاست، معیشت، معاشرت، تعلیم و تجارت یعنی انسانی زندگی کا ہر پہلو جس طرح متاثر ہوا ہے اس نے اس وبا کو ایسی بلا بنا دیا کہ کل تک جو خود کو خدا کہلانے کی دھن میں تھے، خدا ان کو بھی یاد آ گیا، ہمارے ملک عزیز میں تو اس وبا سے ایک پوری ملت کو نفرت، انتقام، دلآزاری اور قساوت و شقاوت کا تختۂ مشق بنا دیا گیا، اس کی تفصیل سے سب واقف ہیں، اس وبا کے بہانے مذہبی فرائض و واجبات اور آداب و رسوم کو پامال کرنے کی کوششیں ایک خاص طبقہ کے ظرف کا بھی آئینہ ہیں۔

یہ غم دوراں ہی ہے جو خدا جانے کیسے کیسے زمانوں کی یاد تازہ کرا دیتا ہے، رمضان اور عیدالفطر کا موسم بہار، خزاں کی ویرانی کی تصویر بن گیا، اب عیدالاضحیٰ بھی اسی بادِ سموم کی زد میں ہے، بظاہر یہ روحانی کرب اور ذہنی اذیت کا سامان ہے لیکن یہی وہ وقت ہے جب ان کی یاد سے دل و دماغ کی دنیا آباد کر لی جائے، جن کی ساری زندگی آزمائشوں اور ابتلاؤں کی داستان بن گئی، قریب ساڑھے تین ہزار سال پہلے کی یہ داستان عزیمت، دنیا بنانے والے کو ایسی بھائی کہ قیامت تک کے لیے اس کو جاودانی حیثیت عطا کر دی گئی، ساڑھے تین ہزار سال پہلے کی دنیا کا تصور بھی عجب ہے کہ گرچہ اس سے پہلے کے زمان و مکان، نبیوں، قوموں، زبانوں، تہذیبوں اور خیر و شر کے تمام مظاہر سے آشنا ہو چکے تھے لیکن اس وقت عالم یہ تھا کہ ساری دنیا میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جس کی سانسوں کی آمد و رفت میں لا اور الاّ کی روح شامل ہوتی، کسی ایک کی عقل کبھی بیدار ہو کر یہ سوال کرنے کی روادار نہ تھی کہ بندگی ان کی کیوں، جن کا وجود خود تمہارے فن خارا تراشی کا مرہون منت ہے، ایک بھی ایسا نہ تھا جو یہ سمجھتا کہ جو بے جان وجود اپنے سود و زیاں کا حساب رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ان کو انسانوں کی زندگی کا محتسب سمجھنا عقل و خرد کے کس اصول سے جائز ہے، آفتاب و ماہتاب اور کواکب و نجوم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کوئی تو

کہتا کہ ایسی غیر ثابت اور تغیر پذیر مخلوقات کو رب نہیں مانا جاسکتا، جو خود تاثر پذیر اور محکوم و مسخر ہو وہ اس قابل کہاں کہ اس کو خدا بنالیا جائے اور جو ایسا سمجھے، اس کی فہم اور عقیدہ اور عمل سب سے بری ہوں، وہ کیسا معاشرہ تھا جس کا حکمراں خود کو بابل کا اولین انسانی خدا کہتا اور جس نے اپنے لیے عرشِ الٰہی تک بنا رکھا تھا، ایسے خدا بیزار اور فطرت وقدرت کے کفر وانکار کے عالمی معاشرے میں اس تنہا ہستی کو یاد کیا ہی جانا چاہیے جو گھر، خاندان، حکمراں سب سے نبرد آزما رہی، پوری دنیا میں وہ واحد شخصیت تھی جس کا نعرہ اور مقصد بھی واحد اور وحید تھا کہ رخ اس کا کیا جائے جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے، وہی ایک رب ہے جس کے لیے ساری کبریائی ہے، جس نے اپنے والد سے صاف کہہ دیا کہ جو حقیقی علم مجھے ملا ہے وہ خارا تراش اس سے محروم ہے، اس لیے انسانی مزاج وفطرت کی یافت کے لیے بیٹے کی رہنمائی ہی کام آئے گی، ظاہر ہے خارا شگافی کی یہ ادا ان کو کیوں بھاتی جنھوں نے عقل وخرد کے تمام دریچے بند کر رکھے تھے، دنیا کے اس واحد موحد کی آزمائش کے دور آتے رہے، باپ چھٹا، گھر چھوٹا، وطن سے بے وطن ہوا، ہجر وہجرت کے کرب سے دوچار ہوا لیکن پائے استقلال میں کہیں لغزش نہیں، زبان پر یہی نعرہ کہ إنی مهاجر الی ربی، جسم وجان کی ہر آزمائش کے بعد ایک بلا رہ گئی تھی، لخت جگر کو لخت لخت کرنا اور دیکھنا، آزمائش لینے والے نے خود اس کو لھو البلاء المبین سے تعبیر کیا، لیکن یہ مرحلہ جس طرح طے ہوا، اس کی یادوں کو زندگی ہر سال، ہزاروں سال سے ملتی رہی ہے اور قیامت تک یہ رسم جنوں یوں ہی جاری رہے گی اور ہر اس انسان کو استقامت اور طمانینت کا پیغام بھی دیتی رہے گی جو زندگی اور اس کی آزمائشوں سے آشنا ہونا چاہتا ہو، اس لیے یہ کہنا برحق اور واجب ہے کہ سلام علی ابراہیم، سلام ہو ابراہیم صدیق پر، ابراہیم اوّاہ وحلیم ومنیب پر اور سلامتی ہو اس کے ان فرزندوں پر جن کی جمعیت کو ملة ابیکم ابراهیم کا اعزاز حاصل ہوا، صحیح کہا گیا کہ ؎

در بیابان طلب دیوانہ شو یعنی ابراہیم ایں بت خانہ شو

آرزوؤں اور حسرتوں کے عالم میں ایک خبر فرحت اثر آئی کہ استنبول کی مسجد ایا صوفیا کے محراب ومنبر اور دیوار ودر قریب ایک صدی کے بعد تکبیر مسلسل کے ترانے سے گونج اٹھے، یہ مبارک ساعت جن خوش نصیبوں کے جذبوں کی عکاس بنی، ان ہی کے کچھ بدنصیب آباواجداد کی شومی قسمت مسجد ایا صوفیا کی ویرانی اور خاموشی کا سبب تھی، ترکی کی خلافت اسلامیہ کی شکست وریخت نے قریب

ایک صدی پہلے ملت کو ایسا گہرا زخم دیا کہ اس کا پورا جسم ہی درد بن گیا تھا اور خود ترکی مرد بیمار کی اذیت ناک چھبتی سے خدا جانے کس طرح خود کو نکالتا اور سنبھالتا رہا، ایا صوفیا عبادت گاہ ہی نہیں، کلیسا کی ہزار سالہ حکمرانی کی علامت تھی، سلطان محمد فاتح نے پہلی بار اس کلیسا کو اللہ کے گھر میں اس وقت بدلا جب انہوں نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے دن اس میں ظہر کی نماز ادا کی، کلیسا کے مسجد میں منتقل ہونے کو سیاسی مورخوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے دیکھا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے سے پہلے صلح کی پیشکش کی اور عیسائیوں کے انکار پر بزور شمشیر یہ شہر فتح کیا گیا، شہر کے سارے کلیسا محفوظ رہے لیکن ایا صوفیا کے ساتھ عیسائیوں نے جو باطل توہمات وابستہ کر رکھے تھے، سلطان محمد فاتح نے انہیں ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہوگا، مولانا تقی عثمانی کے اس خیال سے اتفاق کی بڑی گنجائش ہے، بہر حال اب ایا صوفیا میں سجدوں کے پوشیدہ نشان پھر جبین نیاز سے آشنا ہوں گے اور اس کے منارے اب یہ شکوہ نہیں کریں گے کہ ع

خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

افسوس گذشتہ دنوں کانپور کے فعال اور نہایت متحرک مولانا متین الحق اسامہ قاسمی اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے داماد اور بڑے عالم مولانا سلمان مظاہری نے اس دنیائے فانی کو خیر باد کہا، بھٹکل کے ملا اقبال ندوی بھی اپنے رب سے جا ملے، ملا اقبال ندوی کی شہرت ان کی بے نیازی کی راہ میں آ گئی ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اور ان کے اخلاص اور علم کی راہ میں بے مثال محنت سے آج گویا پورا خطۂ جنوب ندوہ بن گیا ہے، وہ دارالمصنّفین کے عاشق تھے، یہاں تشریف بھی لائے، جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں دارالمصنّفین کی نمائندہ کتابوں پر انہوں نے دس روز محاضرات کا اہتمام کیا، ان کی صورت و سیرت دونوں خاکساری کے رنگ میں ایسے رنگے تھے کہ دیکھنے والوں کو ہیبت کی جگہ صرف محبت کا سرور ملتا تھا، اور ان سطروں کے لکھنے جانے کے بعد اعظم گڑھ شہر کے مشہور اور بہت مقبول معالج اور ماہر امراض قلب ڈاکٹر امتیاز احمد کی وفات سارے شہر کو سوگوار کر گئی۔ ع: آہ! کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور، اللہ تعالیٰ ان سارے مرحومین کے حسنات کو قبول فرمائے۔

الحمد للہ مدیر معارف و ناظم دارالمصنّفین جناب اشتیاق احمد ظلی روبہ صحت ہیں، دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ شفائے کاملہ عطا فرمائے اور شذرات کو پھر ان کے قلم سے زریں بنا دے۔

مقالات

برصغیر میں اردو کے اولین مفسر قرآن
نواب عبدالصمد دلیر جنگ مدراسی

ڈاکٹر راہیؔ فدائی

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ کلام اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ میں سے ایک جلیل القدر صفت ہے۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ خدائے قدوس کی جملہ صفات اس کی ذات اقدس کی طرح قدیم و ازلی اور ابدی ہیں۔ خدائے عزوجل کا کلام ہونے کی وجہ سے اس میں زور بیان کا اعجاز، طرز ادا کی ندرت، معنیٰ آفرینی کی کرشمہ سازی، فصاحت و بلاغت کی انتہائے کمال، مفہوم کی لامحدود گیرائی و گہرائی اور صنائع و بدائع کی حیرت انگیز جدت طرازی کے خزانے موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نزول وحی کے زمانے کا چیلنج ''فأتُوا بِسُورةٍ مِّن مِّثْلِهِ'' (البقرۃ آیت: ۲۳) کی صورت میں آج تک اپنی جلالتِ شان کے ساتھ باقی ہے اور تا قیامت باقی رہے گا۔ کائنات میں موجود جن وانس کا کوئی بھی فرد یا کوئی بھی جماعت اس قدر اعلیٰ وارفع کلام پیش کرنے سے قاصر و عاجز ہے اور رہے گی۔

دنیا کی ہر زبان اپنی آفرینش کے بعد صدیوں کی ممارست اور مشق و مزاولت کے ذریعہ تقریر و تحریر کے توسط سے نشوونما پا کر اس قابل ہوتی ہے کہ اسے اہل علم و فضل معیاری زبان قرار دیتے ہوئے اس کی فصاحت و بلاغت سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اس زبان میں نوشت وخواند کو قابل فخر و لائق تحسین سمجھتے ہیں، اس طرح زبان کی ترقی و ترویج کا سلسلہ زبان کے اختتام تک جاری رہتا ہے۔ یہی لسانیات کا قاعدہ کلیہ ہے مگر حیرت انگیز طور پر اس کلیہ سے عربی زبان مستثنیٰ ٹھہرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان عربی آج سے پندرہ صدیاں پیشتر ہی فصاحت و بلاغت کی معراج حاصل کر چکی ہے۔ اور قیامت تک اس کی یہی بلند و بالا حیثیت اور ارفع و اعلیٰ مرتبت باقی رہے گی۔ عربی زبان کو یہ عظیم الشان

ہاؤس نمبر ۲۱۸، گراؤنڈ فلور، سکنڈ بی کراس، ایچ، بی، آر-فورتھ بلاک، بنگلور۔

امتیاز قرآنِ مجید کی فصاحت و بلاغت کے سبب حاصل ہوا، جیسا کہ کلام پاک کا ارشاد ہے: ''قُل لَّو كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا'' (الکہف آیت:۱۰۹) یعنی کہہ دیجیے اگر سمندر میرے رب کے کلمات (کی وضاحت) کے لیے روشنائی بن جائے تو یقیناً وہ رب کے کلمات اختتام پذیر ہونے سے پہلے ہی سمندر بھر روشنائی ختم ہو جائے گی، اگرچہ اتنی ہی روشنائی مزید لے آئیں (تب بھی وہ کافی نہ ہوگی)۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَلَوْ أَنَّمَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ'' (لقمان آیت:۲۷) یعنی روئے زمین پر جتنے درخت ہیں وہ سب کے سب قلم ہو جائیں اور یہ سمندر جو ہے وہ اور اس کے علاوہ سات سمندر بھی اس میں (بطور روشنائی) شامل ہو جائیں تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔ بے شک اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے۔ اور مزید فرمایا: ''وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ'' (نحل آیت:۱۰۳) یعنی یہ قرآن کریم صاف و شستہ فصیح و بلیغ عربی زبان میں ہے۔

قرآنِ مجید چونکہ خالقِ کائنات کا کلام ہے اور یہ کلام وحی الٰہی کی صورت میں رب تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے سرور انبیاء خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا ہے اس لیے اس کی اعلیٰ و ارفع و بلاغت اور اس کی لفظی و معنوی اعجاز کی کوئی حد و انتہا نہیں ہو سکتی، جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ''ولا یشبع منه العلماء، ولا یخلق علی کثرة الردّ، ولا تنقض عجائبه'' یعنی اہل علم اس (قرآن شریف) کے معانی و مطالب سے کبھی سیر نہیں ہوں گے، کرّات و مرّات تلاوت کرنے کے باوجود اس کی تازگی اور جدت وحدت میں کمی نہیں آئے گی، اور اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ (ترمذی: رقم ۲۰۹۶، دارمی: رقم ۳۳۲۶، مسند احمد: جلد اول، ص:۹۱)

اس بات میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں کہ ترجمہ کا فن مشکل ترین فن ہے اور کسی بھی معیاری زبان کے ادب پارے کا ترجمہ دوسری زبان میں کماحقہ ممکن نہیں ہے، کسی بھی 'متن' (Text) کے لغوی معنے بیان کر دینے سے ترجمہ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ترجمہ یا ترجمانی کا حق کسی قدر ادا ہونے کے لیے دونوں زبانوں یعنی 'متن' کی زبان اور ترجمہ کی زبان میں مہارت تامہ حاصل ہونا ضروری ہے ورنہ مترجم اس فن پارے کے خالق کی مراد کو خود سمجھنے اور اپنے قارئین کو سمجھانے میں ناکام و نامراد رہ جائے گا۔

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

”اچھا ترجمہ اسی وقت وجود میں آسکتا ہے جب مترجم نے نیک نیتی کے ساتھ اپنی شخصیت کو کھو کر مصنف کی شخصیت تلاش کرنے کی کوشش کی ہو، اپنی ذات کی نفی اور اپنی شخصیت کا انکار ایک اچھے مترجم کے لیے ضروری ہے، اپنی بات ہو تو آدمی اسے سو رنگ سے باندھنے کی کوشش کرے، لیکن ترجمے میں تو آدمی خود بندھ جاتا ہے۔“(۱)

اس طرح کی مشکلات کا سامنا مترجمین کو عام طور پر ہوتا رہتا ہے، جس پر وہ کسی نہ کسی حد تک قابو پانے کی سعی مشکور کرتے رہتے ہیں، مگر جب معاملہ کلام پاک کے ترجمے کا ہو جو انتہائی فصیح و بلیغ عربی میں ہے اور صدیوں پیشتر ہی اپنے کمال اعجاز کے آخری حدود پار کر چکا ہے، اس کا ترجمہ تو کیا ترجمانی کا حق ادا کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا۔ بقول ڈاکٹر سید حمید شطاری:

”کسی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا آسان نہیں، قرآن مجید کا ترجمہ کرنا تو اور بھی دشوار ہے، کیونکہ اس کے ترجمے میں ایسے الفاظ کے انتخاب کی ضرورت ہے جو عقائد اور احکام کی پوری پوری ترجمانی کرتے ہوں اور ان الفاظ کا مفہوم منشائے قرآن و فحوائے متن کی صحت کے ساتھ وضاحت کرتا ہو۔ ترجمہ کا بنیادی منشا 'متن' کے خیال اور مفہوم کی ادائیگی ہے۔ مترجم کو زبان پر کامل قدرت ہونی چاہیے، نہ صرف ترجمہ کی زبان پر بلکہ قرآن کی زبان پر بھی اس طرح عبور حاصل ہو کہ وہ ان الفاظ کے وہی معنے لے جو بوقت نزول قرآن سمجھے جاتے تھے۔“(۲)

خالقِ کائنات کے کلام مقدس کا ترجمہ دنیا کی دیگر زبانوں میں کیا جا رہا ہو تو مترجم سراپا عجز و نیاز ہو کر ایک ایک لفظ کو سو سو بار سوچ کر ترجمہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر وہ زبان جس میں کلام پاک کا ترجمہ کیا جا رہا ہو وہ ہزاروں سال کی ترقی یافتہ و پختہ کار کلام نہیں بلکہ صرف پانچ چھ صدیوں کی عمر یافتہ نئی نویلی، ترقی پذیر اور ناپختہ زبان ہو تو کلام پاک کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کے حزم احتیاط کا یہ عالم رہتا ہے کہ وہ ہر لفظ بلکہ ہر حرف پر خدا کی دہائی دیتا ہوا گزرتا ہے اور وہ اپنی بے مائیگی و کم علمی اور اپنے مبلغ علم پر شرمسار ہوتے ہوئے تائید غیبی کے لیے ہر آن بصمیم قلب دعا کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نزول قرآن کے بعد سے تین صدیوں تک کسی

صاحب علم و باعزیمت شخصیت نے دنیا کی دوسری زبانوں میں کلام پاک کا ترجمہ کرنے کی جرأت و ہمت اپنے اندر نہیں پائی۔

اس قدر سخت دشواریوں کے باوجود اہل علم و اصحاب فضل نے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی اپنی علاقائی زبانوں میں کرنے کی سعیٔ مشکور کی تاکہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی عظمت وجلالت کے شعور کے ساتھ ایک عام مسلمان بھی فہمِ قرآن کی طرف راغب ہو۔ مثلاً جنوبی ہند کے صوبۂ کیرل (Kerala) کی عام ہندو و مسلم کی مشترکہ زبان ملیالم کا اولین ترجمہ قرآن ''مولانا محی الدین بن عبدالقادر ماہین کٹّی (ایلیا، کنور Kannur) نے ۱۸۵۵ء (۱۲۷۲ھ) میں کیا مگر وہ ترجمہ ''عرب ملیالم'' میں تھا جس میں رسم الخط عربی اور زبان ملیالم ہوتی ہے۔ بعدازاں تقریباً ساٹھ سال بعد 1918ء (۱۳۳۷ھ) میں ''مولانا وکمّ عبدالقادر مولوی نے خالص ملیالم زبان میں کلام پاک کا ترجمہ کیا۔ پھر محترم پی۔ محمد محی الدین وکمّ نے ۱۹۵۴ء میں بہتر ترجمہ پیش کیا، جس کا ایک ایڈیشن ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا، جنوب کے صوبے آندھرا اور تلنگانہ کی زبان ''تلگو (Telugu) میں ام المدارس مدرسۂ باقیات صالحات، ویلور، ٹمل ناڈو (قائم شدہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء) کے استاذ علامہ قاری سید محمد عرب کے داماد مولانا عبدالغفور صاحب کمبھم (آندھرا) نے قرآن کریم کا مکمل ترجمہ مع حواشی نظام سرکار، حیدرآباد (دکن) کے مالی تعاون سے چھ جلدوں میں ۱۹۲۸ء (۱۳۴۷ھ) میں کیا۔ یہی تلگو زبان کا پہلا ترجمہ تھا، جنوب کی مشہور علاقائی زبان ''ٹمل'' (Tamil) میں مولانا اے، کے، عبدالحمید باقوی (فاضل مدرسۂ باقیات صالحات، ویلور) نے مکمل قرآن مجید کا اولین ترجمہ دو جلدوں میں بالترتیب ۱۹۴۳ء (۱۳۶۳ھ) اور ۱۹۴۹ء (۱۳۶۹ھ) میں کیا۔ اس سے پیشتر ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں ''عرب ٹمل'' (عربی رسم الخط مگر زبان ٹامل) کی تفسیر ''فتوح الرحمانیہ فی تفسیر کلام الربانیہ'' کے نام سے مولانا حبیب محمد عالم ابن صدق محمد ابراہیم قاہری (کابل پٹنمی) نے کی تھی جو ممبئی سے شائع ہوئی تھی۔ جنوب ہی کی ایک اور معروفِ زبان ''مراٹھی'' (Marathi) ہے۔ جس میں قرآن مجید کے پہلے ترجمہ کی سعادت مولانا عبدالرحیم دلوی (پونہ) کو ۱۹۶۲ء (۱۳۸۲ھ) میں حاصل ہوئی۔ علاوہ ازیں صوبۂ کرناٹک کی شیریں وشستہ زبان کنڑا (Kannada) میں محترم عبدالغفار سالیا نے کلام پاک کا اولین بہترین ترجمہ ۱۹۷۸ء (۱۳۹۸ھ) میں کرنے کی خوش بختی پائی۔ (۳)

مذکورہ بالا چند مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دنیا کی مختلف معروف وغیر معروف زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے ہوتے رہے ہیں، الحمدللہ آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے اوران شاءاللہ تاقیامت اس کا تسلسل قائم رہے گا۔ مدینہ منورہ کے شعبۂ ترجمہ قرآن کریم کے معتمد پروفیسر عبدالرحیم مدنی الفاموی نے راقم الحروف سے ایک ملاقات کے دوران فرمایا کہ قرآن مجید وفرقانِ حمید کے تراجم دنیا کی ڈھائی سو(۲۵۰)زبانوں میں تاحال ہوچکے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ ترجمہ کی تمام مشکلات کے باوجود اہل علم واصحاب قلم نے قرآن پاک کے ترجمہ کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ دنیا کی زبانوں میں سب سے پہلا ترجمہ فارسی زبان میں ہوا۔ بخارا کے حکمران منصور بن نوح کے زیر سرپرستی ۳۴۵ھ مطابق ۹۵۶ء میں علمائے فارس نے علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) کی ضخیم تفسیر کے ترجمہ کا مقدس فریضہ انجام دیا۔ یورپی زبانوں میں سب سے پہلا ترجمہ لاتینی (Latin) زبان میں ہوا۔ قرآن کے اس ترجمہ کی سرپرستی فرانس کے کلیسا نے کی تھی، جس کا نام (Peterthevene Rable, Abboto Of Cluny) ہے، یہ ترجمہ اسلامی تعلیمات سے آگاہی اوراس کے معارضے کے لیے بارہویں صدی عیسوی میں کیا گیا۔ علاوہ ازیں انگریزی زبان کا پہلا مکمل ترجمہ قرآن الگزنڈر روز نے ۱۰۵۸ھ مطابق ۱۶۴۸ء میں کیا تھا۔ فارسی کا باقاعدہ قرآن مجید کا اولین ترجمہ ابونصر احمد بن محمد بن حمدان بن محمد نے ۴۸۴ھ مطابق ۱۰۹۱ء میں کیا تھا، جس کا مخطوطہ ٹاپ کاپی پیالیس میوزیم لائبریری، امانت ہنر یننیسی، سکشن ۲۰۹ میں محفوظ ہے۔ (۴)

ترجمہ کی دشواریوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی (متوفی ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۹۷۷ء) نے عمدہ بات کہی ہے:

> ”کتاب کسی زبان کی بھی ہواگرادبی اعتبار سے بلند اور معنوی اعتبار سے عظیم ہے تو اسے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں، ہر صاحب قلم کے لیے کٹھن بلکہ کہنا چاہیے کہ صبر آزما ہے، ہر زبان کی ساخت الگ ہوتی ہے، ترکیبیں جداگانہ، نشست الفاظ کی ایک ہیئت مخصوص، صرف نحو کے قاعدوں، ضابطوں کی ایک وضع خصوصی اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہر لفظ اپنی زبان میں ضمنی مدلولات اور مخفی اشارات وکنایات رکھتا ہے، انہیں زبانِ ترجمہ کے لفظ میں کیوں کر لے آیا جائے۔“ (۵)

قرآن مجید کے ترجمے کے تعلق سے ایک نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق (متوفی ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱ء) نے کہا ہے:

''سب سے پہلی بات زبان پر کامل قدرت ہونی چاہیے، عقائد اور احکام کا دارومدار الفاظ کے مفہوم پر ہے۔ الفاظ کا مفہوم مرورِ زمانہ سے بدل جاتا ہے، اس لیے مترجم کے لیے لازم ہے کہ وہ جانتا ہو کہ جس زمانے میں یہ کتاب نازل ہوئی اس وقت ان الفاظ کے کیا معنیٰ تھے اور قائل کا ان سے کیا مقصود ہے، کبھی کبھی ذو معنی اور پہلودار لفظ بھی آجاتے ہیں۔ ایک جماعت اس کا مفہوم کچھ لیتی ہے اور دوسری جماعت کچھ، اور ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک لفظ کے معنی اور نحوی ترکیب کی وجہ سے عقائد میں اختلاف پیدا ہوگئے اور دو فرقے بن گئے۔ ترجمے میں ایسے الفاظ استعمال کرنا کہ ان میں بھی دونوں پہلو قائم رہیں، بہت دشوار بلکہ اکثر اوقات ناممکن ہوتا ہے۔ ان تمام احتیاطوں کے باوجود ترجمے میں اصل کی سی فصاحت اور خوبیاں اور اثر قائم رکھنا سب سے بڑا دشوار کام ہے۔(۶)

ان دشواریوں کے باوجود قرآن مجید کے تراجم مختلف زبانوں میں ہورہے ہیں، دنیا کا کوئی معروف ملک ایسا نہیں ہے جس کی زبان میں کلام اللہ کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔ ہندوستان میں تراجم کے ساتھ تفاسیر بھی لکھی گئیں''، مولانا محمد عارف اعظمی عمری کی اطلاع کے مطابق شیخ ابن احمد شریحی مارکلی، دہلوی کی تفسیر'' کاشف الحقائق و قاموس الدقائق'' (عربی) سرزمین ہند میں لکھی جانے والی اولین تفسیر ہے، یہ تفسیر عہد السلطان غیاث الدین بلبن (۶۶۵ھ تا ۶۸۵ھ) کی یادگار ہے۔ جس کا مکمل نسخہ مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی کے ذاتی کتب خانہ کی زینت ہے۔''(۷)

قرآن مجید کا ترجمہ کرنا اور اس کی تفسیری وضاحتیں بیان کرنا مشکل ترین کارِخیر ہونے کے باوصف یہ مقدس فریضہ کسی نہ کسی سطح پر ادا ہوتا رہا اور یہ عمل فکری اعتبار سے ناگزیر بھی تھا، یہ اس لیے کہ کلام پاک نے بنی نوع انسانوں سے عموماً اور اہل ایمان سے خصوصاً خطاب کرتے ہوئے بارہا اس کی آیتوں پر تدبّر و تفکرّ کی دعوت دی ہے۔ چنانچہ فرمایا'' كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَ

لِیَتَذَ کَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ‘‘ (صٓ، آیت:۲۹) یعنی یہ کتاب جو ہم نے آپؐ پر اتاری ہے وہ مبارک و مسعود کتاب ہے تا کہ لوگ اس کی آیتوں پر غور وفکر کریں اور اہل دانش وبینش اس سے نصیحت حاصل کریں اور مزید رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ’’اَفَلَا یَتَدَ بَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا‘‘ (محمد، آیت: ۲۴) یعنی قرآن مجید پر کیا وہ غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری عزّ اسمہ ہے ’’وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّ كْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَ لَعَلَّھُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ‘‘ (النحل آیت: ۱۴۴) یعنی یہ یاددہانی ہم نے آپؐ کی طرف اتاری ہے تا کہ آپؐ لوگوں کے سامنے اس کو واضح کر کے بیان کریں جو ان کی طرف اتارا گیا ہے اور شاید کہ وہ اس پر غور وفکر کریں۔ اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر تفکر وتدبر اور اس میں ارشاد شدہ واقعات وسوانح اور اس میں بیان کردہ احکام و نصائح پر غور وفکر کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کے ’متن‘ کے معانی سے واقف ہونا اور اس کی عبارتوں کے مطالب اپنی زبان میں ترجمہ کے ذریعہ آگاہی حاصل کرنا بے حد ضروری ہے ورنہ قرآن مجید کی تلاوت تو ہوجائے گی اور یہ عمل حصول ثواب کا سبب بھی بنے گا مگر منشائے خداوندی کا ادراک اور رب تعالیٰ کے حکم کی کما حقہ تعمیل نہ ہوسکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اہل عزیمت علمائے کرام نے ترجمہ کی اس پر پیچ راہ پر خدائے عزوجل کا نام لے کر قدم رکھا اور اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے منزل مقصود کی یافت میں کامیابی حاصل کرلی۔

انہیں اہل عزیمت واصحابِ بصیرت مفسرین فضلا میں خانوادۂ انوری کے چشم وچراغ نواب عبدالصمد دلیر جنگ مدراسی (متوفی ۱۲۲۹ھ) (۸)، ابن نواب عبدالوہاب نصیرالدولہ بہادر (متوفی ۱۲۱۸ھ) کا اسم گرامی قابل ذکر ہے، جنہوں نے بارہویں صدی ہجری کی اردوئے قدیم یعنی دکنی زبان میں قرآن مجید کی مکمل تفسیر تحریر کرنے کی سعادت حاصل کی اور دو ہزار چھ سو تہتر (2673) صفحات پر مشتمل اپنی طویل تفسیر کا نام اپنے والد ماجد نواب عبدالوہاب کے اسم گرامی سے منسوب کرتے ہوئے ’’تفسیر وہّابی‘‘ رکھا، اس تفسیر کا نادر ونایاب مکمل مخطوطہ چار جلدوں میں اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری (OM.۷) عثمانیہ یونیورسٹی کیمپس، حیدرآباد کا مخزونہ ہے۔

مخطوطہ ’’تفسیر وہابی‘‘ کی تفصیل اس طرح ہے۔ مخطوطہ نمبر (۵۲۸)، سائز (۱۶X۹) سطر (۱۳) کاغذ زرد مائل دبیز جس کے پس منظر میں تاجِ برطانوی (Crown of british empire) کا آبی نشان

مع تاریخ JWHAT MAN 1830 ثبت ہے۔اس نسخہ کا خط نستعلیق خوبصورت اورواضح ہے۔

۱۔جلداول: سورۂ فاتحہ سے سورۂ اعراف میں ''وذکریٰ للمؤمنین'' تک (۵۲۹) صفحات پرمشتمل ہے۔

۲۔جلددوم: سورۂ نمل میں ''اما تعرضن عنهم ابتغاء رحمة من ربك'' الیٰ آخرہ جملہ صفحات (۶۰۹)۔

۳۔جلدسوم: سورۂ یٰسؔ میں ''اتبعوا من لا يسئلكم اجرًا وهم مهتدون'' تک جملہ صفحات (۷۳۰)۔

۴۔جلد چہارم: سورۂ الناس کے اختتام تک ہے جس کے جملہ صفحات (۷۴۲)۔

مذکورہ نسخہ کاغذ پر موجود آبی نشان کی تاریخ ۱۸۳۰ء (مطابق ۱۲۴۶ھ) کے اعتبار سے مفسر نواب عبدالصمد کے وصال کے سترہ (۱۷) سال بعد تحریر کیا گیا ہے۔اس تفسیر کا داخلہ نمبر جلداول (۱۶۱۷۱)، جلددوم (۱۶۱۷۲)، جلدسوم (۱۶۱۷۳)، جلد چہارم (۱۶۱۷۴)، فن نمبر ق (۱۳۱)۔

''تفسیر وہابی'' کا ایک ناقص الاول وناقص الآخر مخطوطہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے جو میر نظام الدین علی خان کی ملکیت میں رہا ہے۔اس نسخہ کی تفصیل حسب ذیل ہے:

''تفسیر وہابی'' یونیورسٹی کلکشن نمبر (۵۳) اردو تفسیر، جملہ اوراق (۲۴۱)، جلدسوم۔

جلد کی ابتدا سورۂ اعراف -۹ سے ہوئی ہے اور جلد کا اختتام سورۂ کہف (۱۸) کی آخری آیت ''قل انما انا بشر مثلکم'' الخ کے ترجمہ وتفسیر پر ہوا ہے۔

نواب عبدالصمد کی علمی کاوشوں میں ''تفسیر وہابی'' کے علاوہ ایک ضخیم تصنیف ''روضۃ الاصفیاء'' ترجمہ قصص الانبیاء (فارسی) کا بھی پتہ چلتا ہے۔جس کا ایک نسخہ ''سالار جنگ میوزیم لائبریری'' کا مخزونہ ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے، ''قصص الانبیاء'' (دکنی)، سائز (۷x۱۱)صفحات (۳۱۹)، سطور (۱۸)، سنہ تصنیف قبل ۱۲۵۲ھ، مصنف نے کتاب کی تمہید میں لکھا ہے:

''فارسی قصص الانبیاء میں جن پیغمبروں کے حالات نہیں تھے، دوسری کتابوں سے لیے گئے ہیں تاکہ پڑھنے والے کو فائدہ حاصل ہو۔'' (فہرست ص:۵۲۲)

قصص الانبیاء (دکنی) کا ایک اور نسخہ ''کتب خانہ انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان کی زینت

بڑھا رہا ہے۔(مخطوطات انجمن ترقی اردو، کراچی، ص ۴۶-۳۷۸)

مفسر قرآن نواب عبدالصمد کے والد ماجد نواب عبدالوہاب خاں نصیر الدولہ بہادر والی کرناٹک نواب محمد علی والا جاہ (ولادت ۱۱۳۵ھ وفات ۱۲۱۰ھ) کے برادر حقیقی تھے، ان دونوں کی والدہ ''فخر النساء'' بحرین کی ایک مقتدر شخصیت کی صاحبزادی تھیں، جن کا مسلکی تعلق جعفریہ، امامیہ اثنا عشریہ سے تھا، والدہ نے اپنے بڑے فرزند کا نام ''محمد علی'' رکھا۔ دوسرے فرزند ''عبدالوہاب'' بھی والدین کے چہیتے اور لاڈلے تھے، ان کے والد سراج الدولہ نواب انورالدین خاں فاروقی گوپاموی شہامت جنگ شہید (شہادت ۱۶/شعبان ۱۱۶۲ھ) کا وطن عزیز خطۂ اودھ کا مشہور قصبہ گوپامؤ (ضلع ہردوئی) تھا، ان کے مورث اعلیٰ شیخ سلیمان بن شیخ مسعود نے تیسری صدی ہجری میں بخارا سے نکل کر اپنی فوج تیار کرلی اور کابل پر حملہ آور ہوکر وہاں اپنی حکومت قائم کرلی۔ انہیں کے اخلاف میں سلطان شہاب الدین احمد معروف بہ محمد فرخ شاہ عادل بن خواجہ نصیر الدین نے رعایا پروری اور عدل گستری میں ایسا بلند مقام حاصل کیا کہ ان کا لقب شاہ عادل ہوگیا۔ منگولی جابر حکمران چنگیز خاں (متوفی ۶۲۴ھ مطابق ۱۲۲۷ء) کے حملوں کی وجہ سے جب کابل کی حکومت زوال آمادہ ہوگئی تو شاہ عادل کے پوتے شیخ محمد احمد شہید کے صاحبزادے قاضی شیخ شعیب نے کابل سے کینوال (ملتان) ہجرت کرکے وہاں مستقل سکونت اختیار کرلی، پھر ایک مدت بعد خاندان شعیب کے بعض افراد ملتان سے بدایوں (اترپردیش) آگئے، اور بعضوں نے شہر قنوج کو اپنا وطن ثانی بنالیا، ایک عرصہ اسی طرح گزرا، بعد ازاں شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد (۹۶۴ھ تا ۱۰۱۴ھ مطابق ۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) کے ابتدائی ایام میں خانوادۂ قاضی شعیب کے چند مقتدر احباب قصبہ گوپامئو آکر آباد ہوگئے۔ یہاں ان کے بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار کی وجہ سے بڑی شہرت وعزت حاصل ہوئی، اس خاندان کے فردِ فرید حاجی محمد انور معروف بہ حاجی مقدس (متوفی ۱۱۱۰ھ مطابق ۱۶۹۹ء) شہنشاہ شہاب الدین شاہ جہاں (خرم) کے دورِ اقتدار (۱۰۳۴ھ تا ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۲۴ تا ۱۶۶۵ء) میں اپنی خداداد صلاحیتوں اور علمی مرتبے کے سبب سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ حاجی مقدس کے صاحبزادے محمد جان جہاں انورالدین بہ مصداق پسر ''نمونۂ پدر است''، علم و اخلاق سے آراستہ، بہادری میں یکتا اور سپہ گری میں مہارت یافتہ تھے، شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیبؒ (متوفی ۱۱۱۸ھ مطابق ۱۷۰۷ء) نے آپ کو والد کے جاگیر واعزازات کے ساتھ خطاب ''خانی'' سے

سرفراز کیا، نواب انورالدین نے اپنی نیک نفسی و دوراندیشی اور ذکاوت وفراست سے مغل حکمرانوں کا نہ صرف دل جیت لیا بلکہ بقول مؤرخ شہیر ''خافی خان'': ''انورالدین دیگر خانہ زادوں اور فدویوں کے مقابلے میں شاہی خدمات میں ممتاز تھے۔'' نواب انورالدین کو عالمگیر کے وارث تخت و تاج محمد معظم بہادر شاہ اول (عہد ۱۱۱۹ھ تا ۱۱۲۴ھ) نے شہامت جنگ کا خطاب عطا کیا۔ علاوہ ازیں عالمگیر کے پرپوتے شہنشاہ روشن اختر محمد شاہ (عہد ۱۱۳۲ھ تا ۱۱۶۰ھ) بن خجستہ اختر جہاں شاہ (مقتول ۱۱۲۴ھ) نے سراج الدولہ کے خطاب سے سرفراز فرما کر نواب آصف الدولہ میر قمرالدین چین خلیج خاں (متوفی ۱۱۶۱ھ) کی ماتحتی میں حیدرآباد (دکن) کی نظامت پر مامور فرمایا۔ (۱۰)، بعدازاں آصف جاہ اول نے ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۷۴۵ء میں نواب انورالدین کو آرکاٹ کا ناظم بنا کر دکن کے مشرقی صوبہ ''کرناٹک'' روانہ کیا۔ کرناٹک کا علاقہ اس وقت بقول افضل العلماء محمد یوسف کوکن:

> ''جنوبی ہند کے مشرقی گھاٹ، ساحل کورومنڈل (Coramandal) اور مغربی گھاٹ کا وہ درمیانی حصہ جو پال گھاٹ، کیرل (Palghat) سے بیدر (Bidar) اور شمال میں گنٹور (Guntur) آندھرا پردیش سے کیپ کومرون (Cape Comorin) ٹمل ناڈو کے وسیع و عریض علاقے تک پھیلا ہوا تھا۔'' (۱۱)

نواب انورالدین کے تقرر پر آرکاٹ کی نظامت کے دعویدار نواب شمس الدولہ حسین دوست خاں چنداصاحب (مقتول ۱۱۶۶ھ) (۱۲) نے مخالفت کی، تاہم انورالدین شہامت جنگ نے چار سال سلطنت کے فرائض منصبی بحسن خوبی ادا کیے مگر چنداصاحب اور ان کے حلیف فرانسیسیوں کی ملی بھگت کی وجہ سے جنگ کی نوبت آ گئی جس میں نواب انورالدین عمر رسیدگی کے باوجود بڑی بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے گڑھ آمبور کے مقام پر جو ویلور سے پچپن کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، بتاریخ ۱۶/ شعبان المعظم ۱۱۶۲ھ مطابق ۱۷۴۸ء جام شہادت نوش کیا۔ نواب شہید کی نعش آرکاٹ کی جامع مسجد میں سپرد خاک کردی گئی، جنگ کے بعد جب حالات پُرسکون ہو گئے تو نواب شہید کے جسد خاکی کو آپ کے دوسرے فرزند نواب عبدالوہاب نصیرالدولہ نے آرکاٹ سے حیدرآباد (دکن) منتقل کیا اور نواب شہید کی وصیت کے مطابق آپ کے مرشد و شیخ حضرت میراں سید شاہ ولی اللہ محمد قادری علیہ الرحمہ (متوفی ۱۱۵۷ھ) کے مزار کے پائیں ان کی آخری آرام گاہ بنا دی۔ (۱۳)

نواب شہید کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے نواب محمد علی والا جاہ جنھیں نواب شہید نے اپنی زندگی ہی میں ولی عہد نامزد کرتے ہوئے آرکاٹ کا حاکم مقرر کیا تھا، کرناٹک کے تاج وتخت کے وارث ہوگئے۔ اس دوران نظام الملک آصف جاہ اول کا انتقال ۱۱۶۲ھ میں ہوگیا، ان کے جانشین کے طور پر نواب نظام الدولہ ناصر جنگ متخلص بہ آفتابؔ کا انتخاب عمل میں آیا، نواب ناصر جنگ نے بتاریخ ۱۰؍ شوال ۱۱۶۲ھ نواب محمد علی والا جاہ کو کرناٹک کا ناظم مقرر کرتے ہوئے نہ صرف اپنی سند سے سرفراز فرمایا بلکہ فرماں روائے ہند محمد ابوالنصر احمد شاہ بہادر غازی (عہد ۱۱۶۱ھ تا ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۴۸ء تا ۱۷۷۴ء) سے سند وخلعت شاہی اور منصب وخطاب ''دلاور جنگ'' دلوائی۔ (۱۴) پھر کچھ ہی مدت بعد نواب ناصر جنگ نے اپنے ہی ماتحت نوابان کرنول وکڈپہ کے ہاتھوں بتاریخ ۱۵؍ محرم الحرام ۱۱۶۴ھ شہادت پائی، منشی برہان خاں ہانڈی نے ''قتل شدامیر دکھن'' سے سنِ شہادت برآمد کیا ہے۔ (۱۵)

نواب محمد علی والا جاہ نے اپنے چھوٹے بھائی نواب عبدالوہاب کے والد کی طرح بڑی قدر افزائی فرمائی، والد نواب انورالدین نے اپنے حین حیات نواب عبدالوہاب کو نلّور (آندھرا پردیش) کی جاگیر عطا کی تھی، تاہم نواب محمد علی والا جاہ نے اپنے دورِ اقتدار میں چتور (آندھرا پردیش) علاقہ بطور جاگیر ان کے سپرد کر کے نظم ونسق کی ذمہ داری بھی سونپی تھی۔ چتور کے قیام کے دوران ٹیپو سلطان شہیدؒ (شہادت ۱۲۱۳ھ) کے والد بانی سلطنت خداداد نواب حیدر علی خاں بہادر (متوفی ۱۱۹۵ھ) اپنے ابتدائی دور میں نواب عبدالوہاب خاں بہادر کی فوج میں اپنے بڑے بھائی شہباز صاحب کے ہمراہ منصب ہزاری پر فائز تھے۔ (۱۶)، نواب عبدالوہاب کے حسن اخلاق کے تعلق سے مؤلف ''تصریح الانساب'' کا بیان ہے کہ: ''بفحوائے الوالد سرٌّ لابیہ'' مثل اپنے آبائے کرام کے نہایت صالح اور متقی، شرفا پروری اور غربا نوازی میں فرید العصر تھے۔ (۱۷) نواب مذکور کی علم پروری وقدردانی کا ثبوت یہ واقعہ ہے کہ مشہور صاحب تصنیف بزرگ قاضی نظام الدین صغیر (متوفی ۱۱۸۹ھ) ابن محمد عبداللہ شہید (شہادت ۱۱۴۵ھ) نواب عبدالوہاب کے دربار سے وابستہ رہے اور نواب صاحب قاضی صاحب کو ایک سو بیگہ زمین بطور جاگیر ''مفریال'' علاقہ ویلور میں بتاریخ ۴؍ ذی الحجہ ۱۱۶۵ھ نواب ناصر جنگ اور نواب انورالدین کے پروانوں پر تصدیق کرتے ہوئے سند عطا کی تھی۔ (۱۸) علاوہ ازیں علامہ قاضی نظام الدین صغیر نے نواب عبدالوہاب کی خواہش پر کئی کتابوں کو عربی سے فارسی قالب میں ڈھالنے کا مستحسن فریضہ انجام دیا۔ جس میں علامہ بہاء الدین عاملی کی مشہور تصنیف ''خلاصۃ الحساب'' کا فارسی ترجمہ مع تشریح بھی

شامل ہے۔ قاضی صاحب نے نواب صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ۱۱۶۵ھ میں قلم اٹھایا مگر کتاب کے دس ابواب میں سے صرف تین باب مکمل کرسکے، شاید منصب قضا کی سرکاری ذمہ داریاں مانع رہیں۔ باقی ابواب کی تکمیل مولانا حاجی احمد مدنی (متوفی ۱۳۰۷ھ) ابن امام العلماء قاضی بدرالدولہ (متوفی ۱۲۸۰ھ) نے فرمائی۔ قاضی صاحب نے اس مقتدر کتاب کا نام نواب صاحب کی مناسبت سے ''فیض الوہاب شرح خلاصۃ الحساب'' رکھا۔ اسی طرح ایک اور کتاب ''فتح الوھاب المجید فی ترجمۃ القول السدید'' نواب صاحب کے اصرار وخواہش پر قاضی صاحب نے تحریر کی تھی۔ یہ دراصل علامہ محمد عبدالعظیم مکی حنفی ابن ملافروخ کے رسالہ ''القول السدید فی بعض مسائل الاجتھاد والتقلید'' کا فارسی ترجمہ ہے جس کو انہوں نے ۱۱۷۸ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اس کے کل صفحات (۱۵۸) اور ہر صفحے پر سطور (۱۶) ہیں۔ بقول مولانا یوسف کوکن عمری اس کا ایک قلمی نسخہ غلام محمد شرف الملک کے کتب خانے میں موجود ہے۔(۱۹) نواب عبدالوہاب نصیر الدولہ کا وصال ۱۵/ذی الحجہ ۱۲۱۸ھ کو ہوا۔ (۲۰)، مؤلف ''تصریح الانساب'' کی تصریح کے مطابق نواب صاحب کے جسد خاکی کو ان کے والد نواب انورالدین کے پہلو میں گنبد شاہ ولی اللہ قادری کے احاطے میں سپرد خاک کیا گیا اور اس تذکرے میں نواب صاحب کی تاریخ وفات ۳/ذی الحجہ ۱۲۱۲ھ مرقوم ہے۔(۲۱)

نواب عبدالوہاب کے دو عقد ہوئے پہلی زوجہ، عادل خاں رضوی کی صاحبزادی تھیں اور دوسرا عقد اپنی ننہالی برادری میں ہوا تھا۔ پہلی اہلیہ محترمہ سے دو صاحبزدے نواب عبدالصمد دلیر جنگ بہادر اور نواب جان جہاں خاں بہادر تہوّر جنگ جو (لاولد) ہوئے اور دو صاحبزادیاں ہوئیں ایک اہلیہ عمدۃ الامراء والاجاہ دوم (متوفی ۱۲۱۶ھ) ابن نواب محمد علی والاجاہ۔ دوسری اہلیہ امیر الامراء روشن الدولہ بہادر (متوفی ۱۲۱۸ھ) ابن نواب محمد علی والاجاہ (متوفی ۱۲۱۰ھ) (۲۲)، نواب عبدالوہاب نے اپنے بڑے فرزند نواب عبدالصمد دلیر جنگ کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی، اس دور کے جید علما و اساتذۂ کرام کے زیر نگرانی حصول علم کا یہ سلسلہ جاری رہا، یہ عین ممکن ہے کہ جنوب کے بلند پایہ مفسر ومحدث، فقیہ و صوفی علامہ نظام الدین صغیر نے جن کا گہرا ربط وتعلق نواب عبدالوہاب سے ۱۱۶۵ھ کے اوائل سے رہا، جیسا کہ قبل ازیں مذکور ہوا ہے۔ نواب عبدالصمد کی تعلیمی سرپرستی کی ہو، اور علوم قرآنی سے عبدالصمد کا انتہائی ذوق علامہ کی صحبت کا نتیجہ ہو۔ اس پاکیزہ ذوق کا ثمرہ آپ کی معرکہ آرا تصنیف ''تفسیر وہابی'' ہے جو علامہ صغیرؔ (متوفی ۱۱۸۹ھ) کے حین حیات ۱۱۸۷ھ مطابق ۱۷۷۳ء میں تحریر کی گئی۔ اور آپ کی یہ

تفسیری کاوش آپ کی نوجوانی (عمر ۳۰ سال تقریباً) کا کارنامہ ہے۔(۲۳)

نواب عبدالوہاب اپنے عالم و فاضل فرزند عبدالصمد کو اپنے ساتھ میدانِ کارزار میں نہیں لے گئے اور انہیں جنگ وجدال کا حصہ نہیں بنایا حالانکہ وہ خود زندگی بھر برسر پیکار رہے۔انھوں نے عبدالصمد کو اہل علم وفضل کی مبارک مجلسوں اور اصحابِ کمال کی نورانی محفلوں کے حوالے کردیا تاکہ وہ علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل کریں اور اپنے اجداد کا نام روشن کریں۔(۲۴)

مفسر قرآن نواب عبدالصمد حسب ونسب کے اعتبار سے فاروقی وناصری ہیں،اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے دوعقد کیے تھے،آپ کا پہلا عقد نوشیروان عادل کی پوتی محترمہ بخت بانو بنت یزدجرسے ہوا،جن کے بطن سے حضرت سالم بن عبداللہ تولد ہوئے جو مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا دوسرا عقد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے نواسے حضرت حسنؓ ابن حضرت علی مرتضیٰؓ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ سے ہوا جن کے فرزند حضرت ناصرالدین محمود ہیں۔(۲۵)،انہیں حضرت ناصر کی اولاد میں انتیس[۲۹] ویں پشت میں مفسر قرآن حضرت نواب عبدالصمد دلیر جنگ کا اسم گرامی شامل ہے۔مکمل شجرہ حسب ذیل ہے۔

نواب عبدالصمد: ۱۔خاں بہادر دلیر جنگ بن نواب عبدالوہاب ۲۔نصیرالدولہ بن سراج ۳۔الدولہ انورالدین خاں بہادر شہامت جنگ بن حاجی محمد انور ۴۔معروف بہ حاجی مقدس بن شیخ منور ۵۔بن شیخ نعم اللہ ۶۔بن مخدوم (۷) شیخ عبدالحی اول (خلیفہ اوّل حضرت نظام الدین امیٹھوی) بن مخدوم ۸۔شیخ عبدالقادر گوپامئوی (خلیفہ بندگی نظام الدین امیٹھوی) بن شیخ محمد عبداللہ ۹۔معروف بہ قاضی لاڈ (قاضی بدایوں) بن قاضی شیخ ابراہیم ۱۰۔اصغر بن شیخ نعمت اللہ ۱۱۔متوطن قنوج) بن قاضی علاءالدین ۱۲۔اصغر بن قاضی محمد ۱۳۔بن قاضی علاءالدین ۱۴۔اکبر بن قاضی شیخ علی ۱۵۔بن قاضی شیخ فخرالدین اصغر ۱۶۔(جن کے بھائی جمال الدین سلیمان کے فرزند مشہور زمانہ ولی کامل حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ متوفی ۶۶۴ھ مطابق ۱۲۶۵ء ہیں) بن قاضی شیخ شعیب ۱۷۔کینوال ملتانی (جن کی اولاد میں حضرت مجدّد الف ثانیؒ شیخ احمد سرہندی متوفی ۱۰۳۴ھ بن شیخ عبدالاحد بن شیخ زین الدین ہیں) بن شیخ محمد احمد شہید ۱۸۔بن خواجہ محمد یوسف ۱۹۔بن سلطان شہاب الدین ۲۰۔احمد المعروف بہ محمد فرخ شاہ عادل (جن کی اولاد میں حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی ہیں) بن خواجہ نصیرالدین

۲۱۔بن سلطان فخر الدین محمود ۲۲۔المعروف بہ نسیماں شاہ بن شیخ سلیمان ۲۳۔بادشاہِ کابل بن شیخ مسعود ۲۴۔بن شیخ عبداللہ الواعظ الاصغر ۲۵۔(مقیم بخارا) بن شیخ عبدالفتح الواعظ الکبیر ۲۶۔بن شیخ اسحاق ۲۷۔بن شیخ ابراہیم اکبر ۲۸۔بن شیخ ناصر الدین محمود ۲۹۔متوطن مدینہ منورہ بن حضرت عبداللہؓ (متوفی ۷۴ھ) بن امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ (متوفی ۲۳ھ)۔(۲۶)

نواب عبدالصمد نے اپنے اجدادی رشتہ دار غلام محی الدین مخاطب بہ عبدالحی خاں ابن شیخ عبدالحی خاں ثانی کی دختر محترمہ والدہ بیگم سے نکاح کیا۔(۲۷) جن سے تین لڑکے اور چار لڑکیاں تولد ہوئیں۔ بڑے فرزند شرف الامرا نعم اللہ خاں بہادر اپنی پھوپی زاد بہن یعنی ناصر میاں بن صادق علی خاں کی دختر سے شادی کی۔

نواب عبدالصمد کے دوسرے فرزند ممتاز الامراء عماد الدین خاں بہار ظفر یار جنگ تھے، جن کا نکاح دختر نجم الدین حسین خاں سے ہوا، ان کی صاحبزادی نواب عظیم جاہ غلام محمد علی خاں بہادر (متوفی ۱۲۸۵ھ) پرنس آف آرکاٹ (اول) سے منسوب ہوئیں۔

عبدالصمد کے تیسرے فرزند عبدالحی خاں کا جوانی میں انتقال ہوگیا۔(۲۸)، ان کی چار صاحبزادیوں میں سے پہلی لڑکی نواب بیگم صاحبہ کا نکاح عظیم الدولہ عبدالعلی خاں والا جاہ سوم (متوفی ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۸ء) سے ہوا۔ دوسری صاحبزادی برہانی بیگم اہلیہ غلام حسن خاں بن محمدی میاں عرف عبدالغنی خاں (ثانی) تھیں۔ تیسری دختر کا نام سگالی بیگم تھا جو وارث علی خاں بن نجم الدین حسین خاں (داماد نواب عبدالوہاب نصیر الدولہ بہادر) سے بیاہی گئیں۔ چوتھی صاحبزادی مُنّی بیگم کا نکاح مشہور عالم وفاضل خان عالم خاں (متوفی ۱۲۷۱ھ)، خلیفۂ مولانا سید محمد علی رامپوری) ابن جان جہاں خاں سے ہوا۔(۲۹) نواب جانِ جہاں خاں بن خیر الدین خاں، صوبہ کرناٹک کے حاکم نواب محمد علی والا جاہ کے ہمشیر زادے تھے۔

نواب عبدالصمد کے نسبتی برادر کا اسم گرامی مولوی نظام الدین احمد خاں ابن عبدالحی تھا، جن کا نکاح نواب محمد علی والا جاہ کی دختر سے ہوا۔(۳۰) نواب عبدالصمد نے اپنے بڑے داماد والا جاہ سوم، نواب عظیم الدولہ کے دور اقتدار (۱۲۱۶ھ تا ۱۲۳۴ھ) میں عہدۂ ''مدار الامرا'' (وزیر اعظم) کے لیے اپنا نام پیش کیا تھا جسے عظیم الدولہ نے بڑی عمدگی سے مسترد کر دیا۔(۳۱) شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نواب عبدالصمد کا تعلق کبھی براہِ راست سیاست وحکمرانی سے نہیں رہا۔ وہ ایک اعلیٰ علمی شخصیت کے مالک تھے

اور بحیثیت مفسر و مصنف معروف وممتاز تھے۔ کرناٹک جیسی وسیع وعریض مملکت کے نظم ونسق اور انتظامی معاملات کے لیے ان کی سرپرستی موزوں نہیں تھی، اسی لیے ان کی پیش کش شکریہ کے ساتھ رد کردی گئی۔

مآخذ وحواشی

(۱) جمیل جالبی ڈاکٹر۔ تنقید وتجزیہ، کراچی ۱۹۶۷ء ص ۱۲۵ بحوالہ محمد سعود عالم قاسمی ڈاکٹر، ''منہاجِ ترجمہ وتفسیر'' فاران اکیڈمی، اسٹریٹ ۲، اقرأ کالونی علی گڑھ ۲۰۰۵ء، ص ۲۴-۲۵۔ (۲) سید حمید شطاری ڈاکٹر، قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد، مطبوعہ ۱۹۸۲ء، ص ۳۰۔ (۳) تراجم کے تعلق سے مذکورہ اطلاعات راقم کو اپنے اسکالر دوستوں سے حاصل ہوئیں جیسے مولانا او کے۔ زین الدین باقوی، اورگم، ڈاکٹر کے۔ پی شمس الدین ترورکاڈ (ملیالم ترجمہ)، مولانا محمد اعظم باقوی راجمنڈری (تلگو ترجمہ)، مولانا محمد حسین باقوی ویلور، مولانا صدقۃ اللہ باقوی، مدرسہ باقیات ویلور، مولانا کووے، عبدالعزیز باقوی (ٹمل ناڈو)، ڈاکٹر یحییٰ نشیط (مراٹھی) محترم فیاض قریشی (کنٹر) راقم ان تمام حضرات کا شکرگزار ہے۔ (۴) مصطفی نجات سیفر سیوگلو، ترتیب وتعارف پروفیسر اکمل الدین احسانو گول، استنبول، ترکی۔
World Bibliography of Translations of The Holi Qur'an(Printed Translations 1515-1980 A.D) Published 2000 A.D by I.R.C.i.c.A, Page-XIII.

(۵) عبدالماجد دریابادی مولانا، تفسیر ماجدی، حصہ اوّل مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۱۹۹۵ء، افتتاحیہ ص ۹۔ (۶) قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ص ۱۳۱۔ (۷) محمد عارف اعظمی عمری ''تذکرۂ مفسرین ہند'' دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، (یوپی) مطبوعہ ۲۰۱۳ء ص ۱-۲۔ (۸) نواب عبدالصمد دلیر جنگ کی تاریخ وفات ۹ر صفر ۱۲۲۹ھ ہے۔ یہ تاریخ ''تاریخ حفظ اللہ خانی موسوم بہ شرف نامہ'' تالیف محمد اولیا النائطی الشافعی المخاطب بہ محمد حفیظ اللہ خاں بہادر حافظ یار جنگ (متوفی ۱۲۶۶ھ) صفحہ ۷۵ سے لی گئی۔ مطبوعہ Madras (Noclxxy) Government oriental Series ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۱ء۔ (۹) برہان خاں ہانڈی منشی (متوفی ۱۲۴۰ھ)، توزک والاجاہی، مطبوعہ اوری ینٹ پریس، حکومت مدراس، ۱۹۷۵ء ص ۱۵۶۔ (۱۰) محمد افضل الدین اقبال پروفیسر ''مدراس میں اردو ادب کی نشوونما'' یوسف شرف الدین ادبی و مذہبی ٹرسٹ، حیدرآباد، مطبوعہ ۲۰۱۰ء (دوسرا ایڈیشن) ص ۶۵-۶۶۔

حکمرانوں کی تاریخیں ''وفیات اعیان الہند'' از ڈاکٹر ابونصر خالدی، شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

مطبوعہ ۲۰۰۵ء سے لی گئیں۔

(۱۱) یوسف کوکن، افضل العلماء، عربک اینڈ پرشین اِن کرناٹک، 1710-1960 (Arabic and Persion in Carnatic) مطبوعہ امیر اینڈ کو، مدراس ۱۹۷۴ء، ۱۳۹۴ھ عرض مؤلف (Preface) ص ا۔ (۱۲) نواب چندا صاحب کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین ''ترچنا پلی'' میں حضرت نطہر اولیا قدس سرہ کے گنبد کے احاطے میں عمل میں آئی۔ (۱۳) ''توزک والا جاہی'' ص ۱۵۱۔۱۵۳۔

(۱۴) ''توزک والا جاہی'' ص ۱۷۷۔۱۸۲۔ (۱۵) ایضاً، ص ۲۰۲۔ (۱۶) حسین علی کرمانی، نشانِ حیدری، شیخ غلام علی اینڈ سنسز، کتاب منزل، لاہور، مترجم محمود احمد فاروقی مطبوعہ ۱۹۶۰ء ص ۳۸۔ (۱۷) محمد یاور حسین فاروقی ابوسعید مولانا گوپامئوی (متوفی ۱۳۶۰ھ) ''تصریح الانساب'' مخطوطہ مخزونہ ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری علی گڑھ ص ۵۷۔ (۱۸) محمد یوسف کوکن عمری افضل العلماء خانوادۂ قاضی بدرالدولہ (متوفی ۱۲۸۰ھ) (جلد اوّل) دارالتصنیف، مدراس، مطبوعہ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء ص ۱۲۸۔ (۱۹) ایضاً، ص ۱۳۷۔ (۲۰) توزک والا جاہی ص xxiii کتاب کے آخر میں مرقوم شجرے میں یہ تاریخ وفات دی گئی ہے۔ امیر الہند نواب محمد علی والا جاہ کی تاریخ وفات ۱۹؍ربیع الاوّل ۱۲۱۰ھ ہے۔ آپ حضرت نطہر اولیاؒ (ترچنا پلی) کے گنبد کے احاطے میں آسودۂ خاک ہیں۔ (۲۱) ''تصریح الانساب'' مخطوطہ ص ۷۵۔ (۲۲) قدرت احمد بن حافظ عنایت احمد بن حافظ شرف الحق فاروقی گوپامئوی، ''خلاصۃ الانساب'' (تصنیف شدہ ۱۲۴۹ھ) بہ تصحیح سید حمزہ حسین عمری، مکتبۂ قلمیہ مخطوطات شرقیہ حکومیہ، مدراس، ص ۹۸۔ (۲۳) ''توزک والا جاہی'' کے بیان کے مطابق نواب محمد علی والا جاہ کی ولادت بتاریخ ۱۴؍شوال المکرم ۱۱۳۵ھ ہوئی تھی۔

نواب والا جاہ کے دو سال بعد بھائی نواب عبدالوہاب کی ولادت ۱۱۳۷ھ میں ہوئی ہو تو عبدالوہاب کا نکاح قیاساً انیس سال کی عمر میں ۱۱۵۷ھ میں ہوا ہوگا۔ اس طرح عبدالوہاب کے پہلے صاحبزادے عبدالصمد کا سن ولادت ۱۱۵۸ھ کے آس پاس مانا جائے گا۔

(۲۴) نواب عبدالصمد کو جنگ وجدال سے دلچسپی نہیں تھی، یہی وجہ ہے کہ اس دور کے اور بعد کے کسی بھی تذکرے میں جنگ میں شامل ہونے کا ذکر پایا نہیں جاتا۔ (۲۵) ''خلاصۃ الانساب'' ص ۸۴۔ (۲۶) ''توزک والا جاہی'' ص ۴۰۹ تا xxiv اور خلاصۃ الانساب ص ۸۴۔۸۵۔ (۲۷) ایضاً، ص iii۔ (۲۸) ''خلاصۃ الانساب'' ص ۹۸۔

(۲۹) ''خلاصۃ الانساب'' ص ۹۲۔۹۶۔ (۳۰) ایضاً، ص ۸۹۔ (۳۱) ''تاریخ حفیظ اللہ خانی'' ص ۸۔۹۔

مثنوی: اصل، ہیئت اور حدود

پروفیسر ظفر احمد صدیقی

غزل، قصیدہ، قطعہ، مرثیہ یہ سب عربی زبان کے الفاظ ہیں اور عربی میں بھی کسی نہ کسی شعری صنف یا ہیئت یا موضوع کے لیے مستعمل ہیں۔ ان سب کے برخلاف لفظ مثنوی عربی زبان میں کسی شعری صنف یا ہیئت کے لیے مستعمل نہیں ہے۔ البتہ اس سے ملتا جلتا ایک لفظ 'مثنویۃ' ہے جو عربی میں استثنا کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی کے مشہور لغت نگار ابن منظور (ف ۷۱۱ھ) نے 'لسان العرب' میں لکھا ہے کہ ثُنیا، ثَنویٰ، ثنیّۃ، مَثنویّۃ اور استثنا یہ سب مرادف اور ہم معنی الفاظ ہیں۔(۱) اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ شاعری کی ایک مخصوص ہیئت یا صنفِ سخن کے لیے 'مثنوی' کا لفظ ایرانیوں کا وضع کردہ ہے، نہ کہ اہل عرب کا۔ مزید وضاحت کے لیے عرض کیا جاتا ہے کہ جس طرح دلیل سے، مُدلل، فارسی زباں دانوں کا بنایا ہوا لفظ ہے، اسی طرح تثنیہ یا مَثنیٰ سے 'مثنوی' بھی اہل ایران کا بنایا ہوا لفظ ہے۔ اصل عربی زبان میں اس کا کوئی وجود یا رواج نہیں۔ پروفیسر گیان چند (ف ۲۰۰۷ء) نے اردو مثنوی سے متعلق اپنے تحقیقی مقالے میں ''مثنوی'' کو عربی کا لفظ بتایا ہے۔(۲) لیکن ان کا یہ بیان غلط فہمی پر مبنی ہے۔

سلسلۂ زیر بحث میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ غیاث الدین رام پوری (ف ۱۸۵۲ء) کا غیاث اللغات (زمانۂ تصنیف ۱۸۲۶ء) فارسی کا پہلا لغت ہے جس میں لفظ مثنوی کی اصل سے بحث کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ 'مثنوی' کا لفظ 'مَثنیٰ' سے بنایا گیا ہے جس کے معنی دو دو کے ہیں۔ اس میں جب یاے نسبت کا اضافہ کیا گیا تو قاعدے کے مطابق الف مقصورہ یعنی کھڑے زبر کو واو سے بدل دیا گیا۔ اس طرح مَثنیٰ سے 'مثنوی' بن گیا۔ غیاث کے اصل الفاظ یوں ہیں:

''مثنوی: منسوب بہ مثنیٰ کہ بفتح میم وسکونِ ثاے مثلثہ وفتح نون والف مقصورہ

پروفیسر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اسمے است معدول از اثنین کہ ترجمہ آں بہ فارسی دودو باشد۔ الف مقصورہ موافقِ قاعدہ درحالتِ الحاق یائے نسبت بواو بدل کردند"۔(غیاث، مادّہ مثنوی) (۳)

بعد کے فارسی فرہنگ نگاروں میں محمد پادشاہ شادؔ نے فرہنگ آنندراج (زمانۂ تصنیف ۱۸۷۵ء) میں (۴)، علی اکبر دہخدا (ف ۱۹۵۶ء) نے 'لغت نامہ' (۵) میں، ڈاکٹر محمد معین (ف ۱۹۷۱ء) نے فرہنگ فارسی (۶) میں اور ڈکٹر سیروس شمیسا نے 'انواعِ ادبی' (۷) میں غیاث کے بیان کو من وعن یا اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے۔

اردو میں سب سے پہلے حکیم نجم الغنی خاں رام پوری (ف ۱۹۳۳ء) نے 'بحر الفصاحت' (۸) میں لفظ مثنوی کی اصل سے بحث کرتے ہوئے غیاث کی عبارت کا اردو ترجمہ کردیا ہے لیکن اپنے ماخذ کی نشان دہی نہیں کی ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ ان کا ماخذ غیاث اللغات ہی ہے۔ خود صاحب آنندراج نے غیاث کی عبارت من وعن نقل کرلی ہے۔ (۹) بعد کے اردو مصنّفین عام طور پر 'بحر الفصاحت' کے خوشہ چیں ہیں۔

مثنوی کی اصطلاحی تعریف اور وجہِ تسمیہ کا قدیم ترین ماخذ شمس قیس رازی (ف مابعد ۶۲۷ھ) کی 'المعجم فی معاییر اشعار العجم' ہے۔ وہ مُزْدَوَج کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"شعریست کہ بناء آن بر ابیاتِ مستقلّ مُصَرّع باشد، و عجم آنرا مثنوی خوانند، از بہر آنکہ ہر یک را دو قافیہ لازم است۔" (۱۰)

(وہ ایسی شاعری ہے جس کی بنیاد 'ابیاتِ مستقلّ مُصَرّع' پر ہوتی ہے۔ اہل عجم اس کو مثنوی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر بیت کے لیے دو قافیہ ضروری ہے۔)

اس تعریف میں 'مُصَرَّع' کا لفظ آیا ہے۔ یہ خود ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ اس کی وضاحت آگے چل کر انھوں نے اس طرح کی ہے:

"مُصَرَّع: بیتے باشد کہ در عروض و ضرب آں در وزن و حروف قافیت متفق اند۔ چنانچہ بُلفرج گفتہ است:

ترتیب ملک و قاعدۂ حلم و رسمِ داذ

عبدالحمید احمدِ عبدالصمد نہاذ

کہ حروفِ قافیت ہر دو مصرع الف وذال است　　　　وزن ہر دو فاعلان است از بحر مضارع

اخرب: مفعولُ، فاعلاتُ، مفاعیلُ، فاعلان۔(۱۱)

(مُصَرَّع: وہ بیت ہے جس کے عروض وضرب وزن میں اور حروف قافیہ میں یکساں ہوں۔ جیسا بُلفرج کہتا ہے:

ترتیب ملک وا لخ۔

اس شعر کے دونوں مصرعوں کے حروفِ قافیہ الف اور ذال ہیں اور دونوں کا وزن بحر مضارع اخرب: ''مفعولُ، فاعلاتُ، مفاعیلُ، فاعلان'' سے فاعلان ہے۔

اس کے بعد تاریخی ترتیب میں سیالکوٹی مَل وارستہ (ف ۱۱۸۰ھ) آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب 'مطلع السعدین' میں مثنوی کی تعریف اور وجہِ تسمیہ ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''ابیاتیست در وزن موافق ودر قافیہ مخالف۔ ہر بیتِ آں دو قافیہ دارد، وہمین است وجہِ تسمیہ۔''(۱۲)

صاحبِ غیاث اللغات نے وارستہ کا تتبع کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''چوں در ابیاتِ مثنوی در ہر بیت دو قافیہ علاحدہ باشد، لہٰذا ابیاتِ مختلف القوافی را مثنوی نام کردند۔''(۱۳)

صاحبِ آنندراج نے غیاث کے الفاظ من وعن نقل کر دیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''چوں در ابیاتِ مثنوی در ہر بیتِ دو قافیہ علاحدہ باشند، لہٰذا ابیاتِ مختلف القوافی را مثنوی نام کردند۔''(۱۴)

علی اکبر دہخدا نے غیاث اللغات اور آنندراج کا حوالہ دیتے ہوئے لغت نامہ میں انھیں کے الفاظ درج کر دیے ہیں۔ چنانچہ رقم طراز ہیں:

''شعرے کہ در ہر بیت آں دو قافیہ علاحدہ باشد، لہٰذا ابیات مختلف القوافی را مثنوی نام کردہ اند۔''(۱۵)

دکتر محمد معین نے بھی اپنے پیش رَوں ہی کا تتبع کیا ہے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

''شعرے کہ ہمہ ابیاتِ آں بیک وزن، ودو مصراعِ ہر بیتش در قافیہ مشترک باشند۔''(۱۶)

اردو میں صاحب بحر الفصاحت نے مثنوی کی اصطلاحی تعریف میں اختصار کو ملحوظ رکھا ہے، رہی وجہِ تسمیہ تو اس سے کوئی تعرض ہی نہیں کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"اصطلاح میں ان اشعار کو مثنوی کہتے ہیں جن میں دو دو مصرعے باہم مقفیٰ ہوں۔"(۱۷)

اس کے برخلاف نور الحسن نیر کاکوروی (ف ۱۹۰۵ء) نے فارسی لغت نگاروں اور دیگر اہم اہل قلم کا تتبع کرتے ہوئے قدرے شرح و بسط سے کام لیا ہے۔ چنانچہ رقم طراز ہیں:

"چونکہ مثنوی کی بیتوں میں ہر ایک بیت کے دو قافیے علاحدہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ابیات مختلفہ کو مثنوی کہنے لگے یعنی ایسے اشعار جن کے ہر بیت کا قافیہ جدا اور ہر دو مصرعے ہم قافیہ ہوں۔"(۱۸)

قاضی محمد اعلیٰ تھانوی (ف نصف ثانی ۱۱۹۱ھ) نے 'کشاف اصطلاحات الفنون' میں 'جامع الصنائع' کے حوالے سے مثنوی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"از استقرا معلوم شدہ است کہ در بحرہاے طولانی مثنوی نگویند چنانچہ بحر رجز تام و رمل تام و ہزج تام و امثال آں، و اوزان مثنوی ہمان است کہ در خمسہ است و آن سکندر نامہ و مخزنِ اسرار و خسرو شیریں و ہفت پیکر و لیلیٰ مجنون است۔ کذا فی جامع الصنائع۔"(۱۹)

(تلاش اور تفحص سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ شعرا لمبی بحروں میں مثنوی نہیں کہتے۔ مثلاً بحر رجز تام، رمل تام، ہزج تام اور ان کے مانند۔ مثنوی کے اوزان وہی ہیں جو کہ خمسہ [نظامی] میں ہیں اور وہ سکندر نامہ، مخزن اسرار، خسرو شیریں، ہفت پیکر اور لیلیٰ مجنوں ہیں۔ بحوالہ جامع الصنائع)(۲۰)

علی اکبر دہخدا (ف ۱۹۵۶ء) نے لغت نامہ (۲۱) میں لفظ مثنوی کے استعمال کی قدیم ترین مثال فرخی سیستانی (ف ۴۲۹ھ) کے کلام سے پیش کی ہے۔ وہ اپنے ایک قصیدے میں کہتا ہے:

شعرِ دراز تر ز 'قِفانبكِ' پیشِ او کوتہ شود چو قافیۂ شعرِ مثنوی (۲۲)

دہخدا نے مولانا روم (ف ۶۷۲ھ) کا درج ذیل شعر بھی لفظ مثنوی کے استعمال کے لیے شاہد کے طور پر پیش کیا ہے:

وحدت اندر وحدت است ایں مثنوی از سمک رَو تا سِماک معنوی (۲۳)

عام طور پر یہ تسلیم شدہ ہے کہ لفظ مثنوی کی طرح صنفِ مثنوی بھی اہل ایران کی ایجاد ہے۔ البتہ یہ سوال معرض بحث میں رہا ہے کہ مثنوی کے ابتدائی نقوش عربی زبان میں ملتے ہیں یا نہیں؟ راقم حروف کی تحقیق کے مطابق اس کا جواب اثبات میں ہے۔ عربی ادب کے مورخین کا بیان ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں عربی میں شاعری کی ایک قسم وجود میں آئی جسے 'مُزْدَوَج' کہتے ہیں۔ مثنوی کی طرح مُزدوج کے بھی ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر کے ساتھ قافیہ بدلتا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس میں طوالت بھی ہوتی ہے اور تسلسل بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ مُزدوج عموماً بحر رجز کے ایک مخصوص وزن رجز مقطوع میں لکھے گئے ہیں۔ اگر چہ زمانۂ مابعد میں خال خال بعض دوسری بحروں میں بھی بعض شعرا نے مُزدوج لکھے ہیں، لیکن ان کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ چونکہ اردو میں مُزدوج سے متعلق معلومات بہت کم ہیں، اس لیے یہاں مشہور مصری صاحبِ قلم اور مورخِ ادب ڈاکٹر شوقی ضیف (ف ۲۰۰۵ء) کی تاریخ ادب عربی کا ایک اقتباس پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: (ترجمہ)

> ''مُزدوج کے ابیات میں قوافی یکساں نہیں ہوتے، بلکہ ہر شعر میں دونوں مصرعوں کے قوافی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ مُزدوج عموماً بحر رجز میں لکھے جاتے ہیں۔ اموی خلیفہ ولید بن یزید کی طرف ایک نظم کا انتساب کیا جاتا ہے جسے اس نے جمعے کے دن خطبے کے طور پر پیش کیا تھا۔ اگر یہ انتساب صحیح ہو تو ولید کو مُزدوج کا موجد کہا جا سکتا ہے۔ پھر عہد عباسی کے لوگ سامنے آتے ہیں جن میں بشّار سرفہرست ہے۔ چنانچہ جاحظ نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے مزدوج لکھا ہے، اگر چہ اس کے مطبوعہ دیوان میں مزدوج کا کوئی نمونہ موجود نہیں۔ عہد عباسی میں جوں ہی تعلیمی شاعری وجود میں آئی تو مزدوج کی ہیئت میں اس نئی تعلیمی شاعری کے بہ کثرت نمونے وجود میں آ گئے۔ چنانچہ ابان بن عبدالحمید نے حکایات، تاریخ، علوم اور دینیات کے موضوعات پر مزدوج کی ہیئت میں بہت سی منظومات تیار کر دیں۔ اسی طرح محمد بن ابراہیم فزاری نے فلکیات کے موضوع پر اپنا مزدوج تیار کیا، لیکن یہ دو دو مصرعوں کے

بجائے مثلث کی شکل میں تھا۔اسی طرح ابوالعتاہیہ نے ’ذات الامثال‘ کے عنوان سے اپنا مُزدوج لکھا۔جاحظ کہتا ہے کہ مُزدوج کے باب میں بشر بن معتمر سے زیادہ قادرالکلام کوئی نہ تھا۔وہ ابان بن عبدالحمید پر بھی فوقیت رکھتا تھا۔جاحظ نے اپنی کتاب الحیوان میں تفضیل علی بن ابی طالب اور ردِّ خوارج کے موضوع پر اس کا طویل مزدوج نقل کیا ہے۔رقاشی کا ایک طویل مزدوج فحاشی اور بے حیائی کے موضوع پر ہے۔اسی طرح بکر بن خارجہ نے نصاریٰ کے تیوہاروں، ان کے امور مذہبی اور ان کے کلیساؤں سے متعلق ایک مزدوج لکھا ہے۔ہمارا خیال ہے کہ اہل ایران جب اپنی زبان کی طرف واپس پلٹے اور ان کے یہاں ادبی نشاۃِ ثانیہ کا دور آیا تو انھوں نے شاعری کی اس قسم یعنی مزدوج کو اپنے قصوں اور حکایات کے لیے استعمال کیا اور اس کو ایک نئے نام ’مثنوی‘ سے موسوم کیا۔“(۲۴)

سطور بالا میں پیش کردہ ڈاکٹر شوقی ضیف کا یہ نقطۂ نظر درست معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کی ہیئت یعنی دو مقفی مصرعوں پر مشتمل مسلسل اشعار کا نظام اہل ایران نے عربی کے مزدوج سے حاصل کیا ہے۔اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شمس قیس رازی (ف مابعد ۶۲۷ھ) نے ’المعجم فی معاییر اشعار العجم‘ میں مثنوی کا ذکر مُزدوج ہی کے عنوان سے کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ”شعرائے عجم آنرا مثنوی خوانند۔“(۲۵) دوسری جانب صاحبِ مجمع الصنائع (۲۶) نے عنوان تو مثنوی کا قائم کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ صراحت بھی کردی ہے کہ ”وایں را مزدوج نیز نامند۔“(۲۷) لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بالکل ابتدا ہی میں ایرانیوں نے مُزدوج میں کئی اہم اور بنیادی تبدیلیاں بھی کردیں۔اول اس کا نام بدل کر مثنوی رکھ دیا۔دوسرے اسے بحر رجز مقطوع کی تنگنائے سے باہر نکال کر عجمی اصوات و آہنگ سے مناسبت رکھنے والی متعدد بحروں سے نہ صرف آشنا کرایا، بلکہ ان کا شناور بنادیا۔تیسرے مضامین و موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے اُسے تھوڑے ہی عرصے میں غیر معمولی وسعتوں سے ہم کنار کرادیا۔

اگرچہ قطعیت کے ساتھ یہ کہنا ممکن نہیں کہ فارسی کا پہلا مثنوی نگار کون ہے؟ لیکن یہ بات شک وشبہے سے بالاتر ہے کہ بالکل ابتدائی دور ہی میں مثنوی نے فارسی میں شہرت و مقبولیت کی منزلیں طے کرلی تھیں، چنانچہ فارسی کے پہلے بڑے معلوم شاعر رودکیؔ (ف ۳۲۱ھ) کے یہاں کئی بحروں میں

مثنوی کے نمونے موجود ہیں۔اسی طرح رودکی کے بعد کے شاعروں میں ابوشکور بلخی (ف اواخر قرن چہارم ہجری) لبیبی (ف اوائل قرن پنجم ہجری) اور عنصری (ف ۴۳۱ھ) وغیرہ کے یہاں بھی ایک سے زائد بحروں میں مثنویوں کے اشعار کی نشان دہی کی گئی ہے۔فردوسی (ف ۴۱۱ھ) بھی انھیں شعرا کا ہم عصر ہے لیکن اس کا نشانِ امتیاز یہ ہے کہ اس نے اپنے شاہ نامے کے ذریعے مثنوی کو اوج کمال تک پہنچا دیا۔

حاصل یہ ہے کہ مثنوی کا آغاز فارسی میں ہوا اور اس نے بہت جلد ہیئت سے گذر کر صنف سخن کا درجہ حاصل کرلیا۔

دوسری تمام کلاسیکی اصنافِ سخن کے درمیان مثنوی کا سب سے امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں طویل بیانیہ کی جو گنجائش موجود ہے وہ کسی دوسری صنف سخن میں نہیں پائی جاتی۔شعر میں کوئی تاریخی یا نیم تاریخی واقعہ بیان کرنا ہو، کوئی حکایت وضع کرنی ہو یا افسانہ طرازی کرنی ہو، تصوف واخلاق یا فکر وفلسفہ کے کسی موضوع پر مرتب ومسلسل اظہارِ خیال کرنا ہو ان سب اغراض ومقاصد کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی صنف سخن موزوں نہیں۔مثنوی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ کائناتِ خارجی کی تصویر کشی اور داخلی جذبات واحساسات کی ترجمانی دونوں کی بہ یک وقت صلاحیت رکھتی ہے۔اس ضمن میں علامہ شبلی (ف ۱۹۱۴ء) رقم طراز ہیں:

> ”شاعری کے جس قدر انواع ہیں سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں، جذباتِ انسانی، مناظرِ قدرت، واقعہ نگاری، تخئیل ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا“۔

پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”مثنوی میں اکثر کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔اس بنا پر زندگی اور معاشرت کے جس قدر پہلو ہیں، سب اس میں آجاتے ہیں۔عشق ومحبت، رنج و مسرت، غیظ وغضب، کینہ وانتقام غرض جس قدر انسانی جذبات ہیں سب کے سماں دکھانے کا موقع مل سکتا ہے۔تاریخ میں مختلف اور گوناگوں واقعات پیش آتے ہیں۔ اس لیے ہر قسم کی واقعہ نگاری کا کمال دکھایا جاسکتا ہے۔مناظرِ قدرت، بہار وخزاں، گرمی وسردی، صبح وشام یا جنگل بیابان، کوہ وصحرا، سبزہ زار وغیرہ کی تصویر کھینچی جاسکتی

ہے۔ اخلاق وفلسفہ، تصوف کے مسائل نہایت تفصیل سے ادا کیے جاسکتے ہیں۔"(۲۸)

بہرحال فارسی شعرانے اس صنف کے امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور مختلف طرز و انداز کی سیکڑوں بلکہ ہزاروں مثنویاں لکھ کر جریدۂ عالم پر نقشِ دوام ثبت کر گئے۔ علامہ شبلی نے مضامین کے اعتبار سے فارسی مثنویوں کو درج ذیل عنوانات میں تقسیم کیا ہے:

رزمیہ یا تاریخ مثلاً شاہ نامہ یا سکندر نامہ وغیرہ۔

عشقیہ: شیریں خسرو۔

اخلاقی: حدیقۂ سنائی و بوستاں وغیرہ۔

قصہ وافسانہ: ہفت پیکر و ہفت بہشت وغیرہ۔

تصوف وفلسفہ: مثنوی مولانا روم و جام جم اوحدی وغیرہ۔

ہم عصر ایرانی مصنف دکتر سیروس شمیسا نے اپنی کتاب 'انواعِ ادبی' میں اغراض مثنوی پر گفتگو کرتے ہوئے بڑی حد تک علامہ شبلی کی تقسیم کو برقرار رکھا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"پس بہ طور کلی می تواں گفت کہ از مثنوی در موارد چہارگانۂ زیر استفادہ می شود:

۱۔ برائے داستان ہائے حماسی و تاریخی مثل شاہ نامۂ فردوسی و گرشاسپ نامۂ اسدی طوسی۔

۲۔ برائے داستان ہائے عاشقانہ یا صوفیانہ مثل خسرو وشیریں، ولیلی ومجنوں، وسلامان وابسال۔

۳۔ برائے طرح آموزہ ہائے عرفانی مثل حدیقۃ الحدیقۃ و منطق الطیر و مثنوی۔

۴۔ برائے طرح مطالب تعلیمی واخلاقی مثل بوستاں۔(۲۹)

غزل اور قصیدے کی طرح صنفِ مثنوی میں بھی اردو نے فارسی کا تتبع کیا ہے۔ اس تتبع کی دو صورتیں رہی ہیں۔ ایک یہ کہ اردو شعرانے فارسی مثنویوں کے اردو میں ترجمے کیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ فارسی مثنویوں کے طرز و انداز پر اردو میں مثنویاں لکھی ہیں۔

اردو میں مثنوی نگاری کی روایت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دکنی شعرانے اس صنف کی طرف خاص توجہ کی ہے اور اس صنف میں کیفیت و کمیت ہر دو لحاظ سے غیر معمولی کارنامے پیش کیے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو ادب کی تاریخ کا دکنی دور دراصل مثنوی نگاری ہی سے عبارت ہے۔ اس ضمن میں فخر الدین نظامی کی کدم راؤ پدم راؤ، اشرف بیابانی کی نوسرہار، نصرتی کی علی نامہ

اورگلشن عشق، وجہی کی قطب مشتری، ملک خوشنود کی جنت سنگار، رستمی کی خاور نامہ، صنعتی کی قصۂ بے نظیر اور ہاشمی کی یوسف زلیخا کے نام بہ طور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔ یہ سب اعلیٰ درجے کی مثنویاں ہیں۔ ان کی صرف تاریخی اورلسانی ہی نہیں بلکہ ادبی اہمیت بھی ہے۔لیکن زبان کی قدامت اور غریب ونامانوس الفاظ کی کثرت نے ہمارے اوران کے درمیان اجنبیت کی دیواریں قائم کردی ہیں۔اس لیے ہم دکنی مثنوی نگاروں کے ساتھ اب تک انصاف نہیں کرسکے ہیں۔

دکنی شعرا کے درمیان ولی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مثنوی کے بجائے غزل کی طرف زیادہ توجہ دی اوراپنی فن کارانہ کاوشوں اورادبی ہنرمندیوں کی وجہ سے اصنافِ سخن کے درمیان غزل کو منصبِ صدارت پر فائز کردیا۔ان کے تتبع کی وجہ سے شمالی ہند کے شعرا مثنوی کے بالمقابل غزل کی طرف زیادہ متوجہ اور مائل رہے۔ یہاں تک کہ پروفیسر گیان چند کو لکھنا پڑا کہ: ’’اردو مثنویاں مقبولیت میں غزل کا سرِ دامن بھی نہ چھوسکیں۔‘‘(۳۰)

ان سب کے باوصف خود گیان چند کی تحقیق کے مطابق صرف شمالی ہند میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں مثنویاں لکھی گئی ہیں۔اس لیے اردو ادب کی تاریخ میں اردو مثنویات کے گراں قدر سرمائے کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

موضوع کے لحاظ سے دکن میں رزمیہ اور بزمیہ دونوں طرح کی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔اس کے برخلاف شمالی ہند کی مثنویوں کا غالب حصہ عشقیہ اورداستانوی ہے۔ جہاں تک مثنوی کے اجزائے ترکیبی کا تعلق ہے توجس طرح مرثیے کے اجزائے ترکیبی اس کا لازمی حصہ نہیں ہیں، بلکہ صنفِ مرثیہ کے عہد بہ عہد ارتقا کے ساتھ ساتھ اس میں رفتہ رفتہ صورت پذیر ہوئے ہیں، یہی صورت وکیفیت عشقیہ اورداستانوی مثنویوں کی بھی ہے۔حکیم نجم الغنی خاں کے بیان کے مطابق نظامی گنجوی وہ پہلے مثنوی نگار ہیں جنھوں نے اپنی مثنویوں میں حمد ومناجات، مدح حاکمِ وقت وتعریفِ سخن وعشق وغیرہ وسببِ تالیف وتصنیف کے عناصر داخل کیے۔(۳۱)اس طریقِ کار کو بعد کے فارسی شعرا کے ذریعے قبول عام کی سند حاصل ہوگئی۔ اردو کے مثنوی نگار شعرا بھی بالعموم اسی روایت کے پیرو رہے ہیں۔کہیں کہیں بعض شعرا نے خفیف سا تغیر وتبدل بھی کیا ہے۔

اردو میں مثنوی کی شعریات پر اول اول گفتگو کا شرف حالی اور شبلی کو حاصل ہے۔شبلی نے

شعرالعجم کی چوتھی جلد میں شاہ نامۂ فردوسی کے غائر مطالعے کے بعد مثنوی کے تعین قدر کے کچھ اصول متعین کیے ہیں اور پھر نہایت شرح وبسط کے ساتھ شاہ نامے پر ان اصولوں کا انطباق بھی کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"کسی مثنوی کی خوبی کا اندازہ کرنا ہوتو یہ دیکھنا چاہیے کہ امور ذیل کا کہاں تک لحاظ رکھا گیا ہے اور شاعر کوان سے عہدہ برآ ہونے میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔"(۳۲)

اس کے بعد انھوں نے درج ذیل عنوانات کے تحت مفصل گفتگو کی ہے:

۱۔حسن ترتیب ۲۔کیرکٹر ۳۔کیرکٹر کا اتحاد ۴۔واقعہ نگاری

شبلی کے برخلاف حالی نے اردو مثنویوں کو پیش نظر رکھ کر مثنوی کے اصول نقد بیان کیے ہیں جن کے اہم نکات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ربط کلام ۲۔فوق العادۃ باتوں سے احتراز ۳۔بیجا مبالغہ آرائی سے احتراز ۴۔مقتضائے حال کے موافق کلام کا ایراد ۵۔بیان واقعات میں موافقتِ عادت کا لحاظ ۶۔تضاد بیانی سے احتراز ۷۔خلاف مشاہدہ بیانات سے احتراز ۸۔موقع ومحل کے لحاظ سے کنایات کا استعمال۔

پروفیسر گیان چند نے شبلی کے مقابلے میں حالی کے اصولِ نقدِ مثنوی کی تعریف وتحسین کی ہے۔اس کے بعد بہترین مثنویوں کی فوقیت کا راز امور ذیل کو قرار دیا ہے:

۱۔حسن تعمیر ۲۔زبان وبیان ۳۔کردار نگاری ۴۔منظر نگاری ۵۔جذبات نگاری ۶۔ہم عصر تہذیب کی مرقع کشی۔

حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں لکھا ہے کہ:"اب تک اردو میں جتنی عشقیہ مثنویاں ہماری نظر سے گذری ہیں،ان میں سے صرف تین شخصوں کی مثنوی ایسی ہے جس میں شاعری کے فرائض کم وبیش ادا ہوئے ہیں۔"(۳۳)اس کے بعد انھوں نے میر کی عشقیہ مثنویوں،میر حسن کی مثنوی بدرِ منیر اور مرزا شوق لکھنوی کی مثنویوں پر مختلف پہلوؤں سے اظہارِ خیال کیا ہے۔مثنوی کی تنقید کے سلسلے میں حالی کی یہ گفتگو اساسی اور بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔طوالت سے احتراز کی خاطر ہم اس مضمون کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

حواشی

(۱)ابن منظور کی اصل عبارت یہ ہے:''وحلفة غیرذات مثنویة أی غیرذات محلّلة ۔یقال حلف فلان یمیناً لیس فیھا ثُنیا ولاثَنوی ولامَثنویة ولااستثناء کله واحد۔ وأصل ھذا کله من الثنی والکفّ والردّ.لأن الحالف إذا قال: واللہ لاأفعل کذاو کذا إلاأن یشاء اللہ غیرہ، فقدردّ ماقاله بمشیئةاللہ غیرہ''(لسان،مادہ ثنی)۔(۲)اردومثنوی شمالی ہند میں،گیان چند،ص۶۱۔(۳)غیاث اللغات، ص۴۰۰،(مادّہ مثنوی)۔(۴)فرہنگ آنندراج،جلدششم،ص۳۸۴۴(مادّہ مثنوی)۔(۵)لغت نامہ،جلد۴۳، ص......(مادّہ مثنوی)۔(۶)فرہنگِ فارسی(متوسط)جلدسوم،ص ۳۸۶۲(مادّہ مثنوی)۔(۷)انواعِ ادبی، ص ۳۳۰۔(۸)بحرالفصاحت،ص۹۰(اصل عبارت یوں ہے:''لغت میں مثنوی منسوب ہے مثنیٰ کی طرف،اور مثنیٰ میم مفتوح وسکونِ ثائے مثلّثہ والف مقصورہ دو کے معنی میں ہے۔جب یائے نسبت اس کے آخر میں لگائی گئی تو الفِ مقصورہ واو سے بدل گیا۔'')(۹)فرہنگ آنندراج،جلدششم،ص ۳۸۴۴(مادّہ مثنوی)۔(۱۰)المعجم فی معاییر اشعارالعجم،ص۴۱۸۔(۱۱)ایضاً،ص۴۱۹۔(۱۲)مطلع السعدین،ص۹۔(۱۳)غیاث اللغات،ص۴۰۰۔ (۱۴)فرہنگ آنندراج،جلدششم،ص۳۸۴۴(مادّہ مثنوی)۔(۱۵)لغت نامہ،جلد ۴۳،ص......(مادّہ مثنوی)۔ (۱۶)فرہنگ فارسی(متوسط)جلدسوم،ص۳۸۶۲(مادّہ مثنوی)۔(۱۷)بحرالفصاحت،ص۹۰۔(۱۸)نوراللغات، جلدسوم(مادّہ مثنوی)۔(۱۹)کشاف اصطلاحات الفنون،جلداول ص۱۸۰(مادّہ الثّانیۃ۔المثانی۔المثنوی)۔ (۲۰)'جامع الصنائع' کے مصنف ہدایت اللہ حسینی شیرازی ہیں۔اس کا موضوع علم بدیع ہے۔(۲۱)لغت نامہ، جلداول،ص۴۳۔(۲۲)فرخی کا یہ قصیدہ خواجہ ابوسہل کی مدح میں ہے۔اس کا مطلع یوں ہے:

اے قصدِ تو بہ دیدنِ ایوانِ کسروی اندیشہ کردہٴ کہ بہ دیدارِ آں روی

(دیوان فرخی،ص۴۰۲)

مثال میں پیش کردہ شعر میں 'قِفانبكِ'' سے مراد امروٴالقیس کا قصیدہٴ لامیہ ہے،جو''قِفانبكِ'' سے شروع ہوتا ہے۔ یہ سبعہ معلقہ کا پہلا قصیدہ ہے اور تبریزی وابن الانباری کی روایت کے مطابق ۸۲/ابیات پر مشتمل ہے۔شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اے ممدوح آپ کے حضور میں امروٴالقیس کے معلقہ سے بھی درازتر قصیدہ،مثنوی کے قافیے سے بھی زیادہ کوتاہ ہوجاتا ہے،جو محض دو مصرعوں میں تمام ہوجاتا ہے۔یعنی ہمارے قصائد کتنے ہی درازتر کیوں نہ ہوں،آپ کے اوصاف وکمالات کے بالمقابل بہ کوتاہ معلوم ہوتے ہیں۔(تبریزی اور ابن الانبار کے حوالے کے لیے ڈاکٹر اجمل اصلاحی کا ممنون ہوں)۔(۲۳)مثنوی مولانا روم،مرتبہ نکلسن،ص ۳۸۸(بحوالہ

''وحدتِ وجوداز دیدگاہ ''مولانا'' از ملک محمد فرخ زاد) لیکن یہاں مصرعِ ثانی کا متن اس طرح ہے:''از سمک رو تا سماک اے معنوی'' (اس حوالے کی تلاش کے لیے پروفیسر سراج اجملی کا مشکور ہوں)۔(۲۴) تاریخ الادب العربی، المجلد الثالث، شوقی ضیف، ص۱۹۶-۱۹۷۔(۲۵) المعجم فی معاییر اشعار العجم، ص۴۱۸۔(۲۶) مجمع الصنائع کے مصنف نظام الدین احمد بن محمد صالح صدیقی حسینی ہیں۔ یہ کتاب ۱۰۶۰ھ میں تالیف ہوئی۔ ۱۸۲۵ء میں مطبع حسینی لکھنؤ سے طبع ہو چکی ہے۔(ان تفصیلات کی فراہمی کے لیے پروفیسر آصف نعیم کا ممنون ہوں) (۲۷) بحوالہ کشاف اصطلاحات الفنون، ص۱۸۰ (مادّہ الثانیۃ۔ المثانی۔ المثنوی)۔(۲۸) شعر العجم، جلد چہارم، ص۱۸۹-۱۹۰۔(۲۹) انواع ادبی، ص۳۳۰-۳۳۱۔(۳۰) اردو مثنوی شمالی ہند میں، ص۶۱۔(۳۱) بحر الفصاحت، ص۹۰۔(۳۲) شعر العجم، جلد چہارم، ص۱۹۳۔(۳۳) مقدمہ شعر و شاعری، ص۲۲۰۔

مراجع و مآخذ

(۱) اردو مثنوی شمالی ہند میں، پروفیسر گیان چند، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، طبع دوم، ۱۹۸۷ء۔(۲) امین الکافی، ترجمہ متن الکافی فی علمی العروض والقوافی، مترجم ابوعبیدہ، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، طبع دوم ۱۹۷۶ء۔(۳) انواعِ ادبی، دکتر سیروس شمیسا، انتشارات باغ آئینہ، ۱۳۲۸۔(۴) بحر الفصاحت، حکیم نجم الغنی خاں رام پوری، مطبع نول کشور، لکھنؤ، طبع دوم ۱۹۱۷ء۔(۵) تاریخ الأدب العربی، دُکتور شوقی ضیف، المجلد الثالث، دار المعارف مصر، بدونہ سنۃ۔(۶) دیوانِ فرخی سیستانی، جمع و تصحیح علی عبدالرسول آبان، ۱۳۱۱۔(۶) شعر العجم، شبلی نعمانی، جلد چہارم، دار المصنّفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء۔(۸) غیاث اللغات، غیاث الدین رام پوری، مطبع نول کشور، کان پور، ۱۸۸۷ء۔(۹) فرہنگ آنندراج، محمد پادشاہ شاد، جلد ششم، انتشارات کتابفروشی خیام، ۱۳۶۲شمسی۔ (۱۰) فرہنگِ فارسی (متوسط) دُکتر محمد معین، جلد سوم، مؤسسۂ انتشارات امیر کبیر، تہران، ۱۳۷۱۔(۱۱) کشاف اصطلاحات الفنون، محمد اعلیٰ تھانوی، ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ، ۱۸۸۲ء۔(۱۲) لسان العرب، جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور، جلد ۱۴ (و-ی) دار صادر، بیروت، ۱۹۶۸۔(۱۳) لغت نامۂ دہخدا، علی اکبر دہخدا جلد ۴۳ (م- مالیات) تہران، شہر پور، ۱۳۵۲ ہجری شمسی۔(۱۴) المعجم فی معاییر اشعار العجم، شمس الدین محمد بن قیس الرازی، تحقیق محمد بن عبدالوہاب قزوینی، کتابفروشی تہران، سنہ ندارد۔(۱۵) مطلع السعدین، سیالکوٹی مل وارستہ، مطبع نول کشور، اکتوبر ۱۸۸۰ء۔(۱۷) مقدمہ شعر و شاعری، خواجہ الطاف حسین حالی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، طبع ششم ۲۰۰۳ء۔ (۱۷) نور اللغات، نور الحسن نیرؔ کاکوروی، سوم چہارم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور (عکسی ایڈیشن) ۱۹۸۹ء۔

"حیات امام مالکؒ" کا تنقیدی مطالعہ

کلیم صفات اصلاحی

"حیات امام مالک" مولانا سید سلیمان ندویؒ کی پہلی کتاب ہے اور غالباً اردو زبان میں اس موضوع پر بھی یہ اولین تصنیف ہے۔ سید صاحب کی علمی زندگی کی ابتدا کی یہ یادگار ہے جس سے ان کی علمی و تحقیقی اٹھان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جب انہوں نے اس کی تصنیف کا آغاز کیا تو عربی و فارسی مصادر کے دفتر کھنگالنا گویا چیونٹی کے منہ سے شکر کے دانے چننے کے مترادف تھا۔ چنانچہ کتاب کا تقریباً ہر صفحہ ان کی محنت، دقتِ نظر، وسعت مطالعہ، موضوع کا احاطہ، فقہی بصیرت، متانتِ اسلوب، فکری توسع، مسلکی بے تعصبی، اصابت رائے اور سب سے بڑھ کر امام مالکؒ اور ان کے کارنامہائے حیات کے بیشتر پہلوؤں کی جامع مرقع آرائی کی شہادت دیتا ہے۔ اس طرح یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ اردو زبان و ادب میں مالک شناسی کی بنیاد علامہ سید سلیمان ندویؒ نے رکھی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سید صاحب شروع ہی سے علم و تحقیق کی پامال راہوں پر چلنے کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے ہمیشہ نئے اور انوکھے موضوعات اور مضامین کا انتخاب کیا۔ چاہے انہیں اس کے لیے عوائق و مشکلات کے ہفت خواں طے کرنے پڑے ہوں۔ حیات امام مالک کے موضوع کا بھی اسی لیے انہوں نے انتخاب کیا اور کامیاب گذرے۔

سبب وجذبۂ تصنیف: سید صاحب کے دل دماغ میں اس تصنیف کا خیال کب اور کیوں آیا؟ اور اس کے پیچھے کون سا جذبہ تھا؟ قابل غور ہے۔ سید صاحب کا ماحول، خاندانی پس منظر یا جن اساتذہ سے انہوں نے کسب فیض کیا تھا ان کے مسالک فقہ میں سے کوئی بھی ایسی چیز بظاہر نظر نہیں آتی جس کو سید صاحب کے امام مالک کی جانب میلان کا سبب قرار دیا جا سکے۔ یہ صرف ان کا ذاتی مطالعہ،

رفیق دارالمصنّفین۔

طلب حدیث اور موٴطا سے ان کی حد درجہ عقیدت ومحبت تھی جو دربار مالکی تک ان کو لے گئی اور نتیجے میں یہ اہم علمی خدمت انجام پائی۔اس ضمن میں خود سید صاحب کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

> ''مجھ کو علم حدیث کی ابتدائے طلب سے امام موصوف اور ان کی موٴطا سے بدرجۂ غایت عقیدت رہی ہے۔اسی کا اثر تھا جس نے مجھے اس فرض کے انجام پر آمادہ کیا۔چنانچہ طالب العلمی کے زمانہ میں میں نے اس کام کا سلسلہ شروع کیا اور جنوری ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں اس پر ایک مضمون لکھا۔(۱)

اس تصنیف کی تدوین کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا،اس کی نشاندہی پروفیسر خلیق نظامی نے اس طرح کی ہے:

> ''سیرت امام مالک'' کی تدوین میں جو جذبہ کارفرما تھا وہ ایسے شخص کے حالاتِ زندگی سے باخبر کرنا تھا جس کی تالیف میں حجازی فکر جلوہ گر تھی۔موٴطا تاریخی، فقہی،محدثانہ تینوں حیثیتوں سے فکر اسلامی میں اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔شاہ ولی اللہ کی تو یہ رائے تھی کہ''صحیح بخاری وصحیح مسلم ہر چند در بسط وکثرت احادیث دہ چند موٴطا باشد لیکن طریق روایت احادیث وتمیز رجال وراہ اعتبار واستنباط از موٴطا آموختہ اند''۔(ترجمہ:صحیح بخاری وصحیح مسلم وسعت وکثرت احادیث میں گو کہ موٴطا سے دس گنا ہیں لیکن روایت حدیث کے اصول،تحقیق رجال اور استناد واستنباط مسائل کے اسلوب کے لحاظ سے ان دونوں کا مقام موٴطا سے کم ہے۔)
>
> مولانا سید سلیمان ندویؒ شاہ ولی اللہ کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے اور موٴطا کو دینی فکر کی اساس بنا کر مسائل پر رائے دیتے تھے۔حقیقتاً انہوں نے امام مالک پر الندوہ میں ایک طویل مضمون لکھا تھا بعد کو اس میں اضافہ کیا اور کتاب کی صورت میں شائع کردیا۔''(۲)

حیات امام مالک کی ابتدا اور اس کی تکمیل کا خیال: سطورِ بالا میں گزر چکا ہے کہ سید صاحب نے طالب علمی کے زمانہ میں اس کی ابتدا کی اور الندوہ جنوری ۱۹۰۷ء میں اس کی پہلی قسط شائع ہوئی۔اس کے بعد اس کی اشاعت کا سلسلہ الندوہ کی ایڈیٹری اور بعض دوسرے موضوعات ومضامین کی

تحقیق کے سبب رک گیا۔فراغت تک اس کی نوبت نہیں آئی۔فراغت کے بعد اس کو مکمل کرنے کا خیال دامن گیر ہوا اور اجتہاد کی بحث شروع ہوئی تھی کہ علامہ شبلیؒ کا انتقال ہو گیا اور قلم کو روکنا پڑا۔یہ پوری تفصیل خود سید صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

> ''فراغت کے بعد سب سے پہلے اسی کتاب کی تکمیل کا خیال ہوا۔ابھی تصنیفات کا حصہ ختم ہوا تھا اور اجتہاد کی بحث شروع ہوئی تھی اور جو اصل میں اس کتاب کا جوہر ہوسکتا تھا کہ حضرت الاستاد نے وفات پائی اور دمِ نزع وصیت فرمائی کہ تمام کام چھوڑ کر سب سے پہلے سیرۃ النبی کی تکمیل کی جائے۔اس بنا پر جہاں تک حیات امام مالک کی مسافت طے ہو چکی تھی قلم کا مسافر وہیں پہنچ کر رک گیا اور اب آئندہ اس کی تکمیل کی فرصت ہاتھ آنی مشکل معلوم ہوتی ہے۔اس لیے جو حصہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے،اس کو وقفِ ناظرین کیا جاتا ہے''۔(۳)

''حیات امام مالک'' کی اولین طباعت: علامہ سید سلیمان ندویؒ کا بیان ہے کہ ''حیات امام مالک خاکسار کی پہلی کتاب ہے جو طالب علمی کے زمانہ میں پہلے مضمون کی حیثیت سے شروع ہوئی پھر بڑھ کر کتاب ہوگئی''۔(۴) لیکن طباعت کے اعتبار سے ان کی سب سے پہلی کتاب ''لغات جدیدۃ'' ہے جو ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔(۵) اس کے بعد ''تاریخ ارض القرآن'' کے دو حصوں میں پہلا حصہ اپریل ۱۹۱۵ء میں لکھنؤ کے مطبع شاہی سے شائع ہوا۔(۶) مہینہ اور سنہ کا تعین ''ارض القرآن'' کے دیباچہ سے کیا گیا ہے۔(۷) معارف پریس کے قیام کے بعد ارض القرآن کا پہلا حصہ ۱۹۱۷ء اور دوسرا ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔(۸) ''حیات امام مالک'' ارض القرآن کے پہلے حصہ کی اشاعت کے بعد اگست ۱۹۱۷ء میں معارف پریس سے پہلی بار زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔

یہاں اس مضمون کا ذکر ضروری ہے جو نگار اکتوبر ۱۹۳۶ء میں عبدالملک آروی نے ''سید سلیمان ندوی کی فنّی وتاریخی غلطیاں'' کے عنوان سے لکھا تھا۔اس مضمون میں مقالہ نگار نے حیات امام مالکؒ کے تصنیفی وتالیفی نقائص اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ان کا یہ کہنا ہے کہ اس میں ادب وانشا اور معلومات و تحقیقات میں خامیاں اور اغلاط کی کثرت ہے۔آروی صاحب حیات امام مالک کی کمیوں کی جانب نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مجھے توقع تھی کہ مصنف نے واقعات وحالات پوری کاوش سے جمع کیے ہوں گے۔معلومات میں اضافہ کیا ہوگا لیکن ادب وانشا کی خامیاں، تحقیق وجستجو کا فقدان، اسقام ونقائص کی فراوانی، تصحیفات واغلاط کی کثرت دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی۔''

(بحوالہ معارف اگست ۱۹۷۷ء ص ۱۱۶)

سید صاحب نے جب یہ کتاب تصنیف فرمائی تو اس موضوع پر اردو زبان میں کوئی مستند و معتبر کتاب موجود نہیں تھی۔ایسے میں یہ کہنا کہ سید صاحب نے معلومات میں اضافہ نہیں کیا خود ہی مدعی کے دعویٰ کے بطلان کے لیے کافی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ حیات امام مالک کی ایک ایک سطر سید صاحب کے اسلوب تحقیق کے بلند معیار کی گواہ ہے۔کوئی بات سید صاحب نے شاید ہی بلا حوالہ کہی ہو اور حوالہ بھی عربی وفارسی کی ایسی معتبر ومستند کتابوں کا جن میں سے بعض کے مآخذ کے متعلق عام کیا خاص اہل علم کو بھی خبر ہونا مشکل ہے کہ ان میں امام مالک سے متعلق مواد موجود ہوگا۔کسی دینی ومذہبی شخصیت کے حالات وکوائف کی عکاسی اور محققانہ کتاب کے لیے انہوں نے جو ادیبانہ اسلوب اختیار کیا ہے وہ عموماً اس قسم کی سوانح عمریوں میں کم ہی کہیں دیکھنے کو ملتا ہے لیکن نقادِ محترم کو اس میں ادب وانشا کی خامیاں نظر آتی ہیں یوں بھی یہ کتاب سوانح کے موضوع پر ہے ادب وانشا اس کا موضوع نہیں لیکن سید صاحب نے اس میں حتی الوسع ادب کی شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کا اجمالی جائزہ اسی مقالہ کے اگلے صفحات میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔نقاد صاحب نے اس کتاب پر تنقید کے لیے خود جو طرز و انداز اختیار کیا ہے وہ بجائے خود غیر منصفانہ ہے۔اس تنقید پر رائے زنی کرتے ہوئے عشرت افروز صاحبہ نے بالکل سچی بات تحریر کی ہے:

''معترض کے اکثر اعتراضات اپنی جگہ پر درست نہیں۔معترض اس کے بھی مدعی ہیں کہ سید صاحب موصوف کی ''حیات امام مالک'' میں ادب وانشا کی خامیاں ہیں مگر معترض کے تیس صفحہ کے مقالہ میں کہیں ایک جگہ بھی ادب وانشا کی خامیاں نہیں دکھائی گئی ہیں۔'' (معارف اگست ۱۹۷۷ء ص ۱۱۶، ۱۱۷)

''حیات امام مالک'' کے متعدد ایڈیشن: اس کتاب کے متعدد ایڈیشن منظر عام پر آئے۔ ہمارے پیش نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جس پر عربی سنہ اشاعت ۱۳۴۰ھ رقم ہے۔عیسوی کے لحاظ سے

یہ سنہ ۱۹۲۱ء ہوتا ہے۔ دارالمصنّفین کے کتب خانہ میں معارف پریس سے شائع شدہ کوئی ایڈیشن نہیں ہے۔ زیر نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ٹورنٹو لائبریری، اونٹیریو کناڈا کی ویب سائٹ سے حاصل کیا گیا ہے۔ اس پر ۱۸/دسمبر ۱۹۶۸ء کی مہر لگی ہے جس سے اس کتاب کے اس لائبریری میں پہنچنے کی تاریخ کا علم ہوتا ہے۔ اس لائبریری میں یہ کتاب سوانح کے فن میں اس نمبر BP/80/M3 N331921 کے تحت درج وموجود ہے۔ ۲۰۱۱ء میں یونیورسٹی کے مالی تعاون سے انٹرنٹ آرکائیوز نے ڈیجیٹائز کیا اور افادۂ عام کی غرض سے اس کو انٹرنٹ پر ڈال دیا لیکن اس میں سید صاحب کا تحریر کردہ دیباچہ نہیں ہے۔ غالباً اسکین ہونے سے رہ گیا ہے۔

دارالمصنّفین میں مکتبہ الشرق، آرام باغ، کراچی سے ۱۹۵۱ء میں شائع شدہ ایڈیشن موجود ہے۔ اس کے شروع میں سید صاحب کا مختصر پیش لفظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے تھے۔ تفصیل سید صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

> ''اس کے (یعنی ۱۹۱۷ء کے) بعد اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ ادھر کئی سال سے اس کا کوئی نسخہ موجود نہ تھا۔ احباب کا تقاضا جاری تھا۔ یہ دیکھ کر پاکستان میں اس کے نئے ایڈیشن کی تیاری کی گئی اور بحمداللہ چھپ کر تیار ہوگئی۔'' (۹)

''حیات امام مالک'' کا ۵۶ صفحات پر مشتمل ایک اور ناقص الطرفین نسخہ بھی دارالمصنّفین کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ شاہی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ اس کی کتابت وطباعت اور کاغذ وغیرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طبع اول کی اشاعت کے فوراً بعد ہی شائع ہوا ہوگا۔ اس میں فہرست، دیباچہ اور ''منبر نبویؐ'' کی سرخی کے بعد آخر کے تمام صفحات غائب ہیں۔ مطالعہ اور اصل نسخہ سے موازنہ کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں جگہ جگہ عبارتوں اور جملوں کو بدل دیا گیا ہے اور بے جا حک واضافہ کیا گیا ہے۔ اس مطبوعہ نسخے میں ہر صفحہ پر تصحیح کی عبارتیں اور جملے موجود ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصل نسخہ سامنے رکھ کر عبارتوں اور جملوں کی تصحیح یا مطابق اصل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو لوگ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خط سے واقف ہیں وہ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ تصحیحات خود سید صاحب کے قلم سے ہیں۔ اس طرح یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شاہی پریس لکھنؤ کا یہ نسخہ غیر معتبر اور ناقابل اعتبار واستناد ہے اور ایسا لگتا ہے کہ کسی نے تحریف وتغیر کر کے اس کو اپنے نام سے چھپوانے کی

کوشش کی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ: ''حیات امام مالک'' کے تعارف پر سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم سابق ناظم دارالمصنّفین نے تقریباً ۳۵ برس پہلے معارف میں صاف طور پر لکھا تھا کہ حیات امام مالک سید صاحب کی کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ انھوں نے اس عنوان سے الندوہ میں کئی قسطوں میں مضمون لکھا تھا۔ تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

> ''یہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ اس کو مضامین کا مجموعہ سمجھنا چاہیے۔ جب وہ ابھی تیئیس برس کے تھے تو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان الندوہ میں ۱۹۰۷ء میں ''حیات امام مالک'' کے عنوان سے کئی قسطوں میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں اضافہ کرکے اس کو ایک مستقل تصنیف بنانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اپنی اور مشغولیتوں کی وجہ سے یہ نہ کرسکے۔ ان کے قلم کا مسافر جہاں رکا تھا وہیں رکا رہ گیا۔ اس کی افادیت کا خیال کرکے دارالمصنّفین کے ابتدائی دور میں اس کو اگست ۱۹۱۷ء میں کتاب ہی کی صورت میں شائع کردیا گیا جس کے اب تک متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں''۔ (۱۰)

حیات امام مالک کی تصنیف وطباعت کے سلسلہ کی تفصیلات خود سید صاحب کے قلم سے آچکی ہیں۔ اس لیے سید صباح الدین صاحب کا حیات امام مالک کے سلسلہ میں یہ کہنا کہ الندوہ میں اس کی کئی قسطیں شائع ہوئیں، یہ خلاف واقعہ ہے۔ سید صاحب نے الندوہ جنوری ۱۹۰۷ء میں صرف ایک قسط ہی شائع کی تھی۔ اس کے بعد دوران تعلیم انہیں اس میں اضافہ کا موقع نہیں ملا۔ فراغت کے بعد انھوں نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا اور منصوبہ کے مطابق کتاب کا بیشتر حصہ مکمل کرلیا۔

شبلی صدی کی مناسبت سے دارالمصنّفین نے عہد شبلی کے الندوہ کی اشاعت کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ تمام شماروں کا عکس لے کر سالانہ جلدوں کے لحاظ سے نو جلدوں میں ۲۰۱۶ء میں شائع کیا۔ راقم الحروف کو ان تمام جلدوں میں دوسری قسط نظر نہیں آئی۔ اس طرح یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے کہ سید صاحب نے ''حیات امام مالک'' کے عنوان سے قسط وار الندوہ میں مضامین لکھے یا یہ کہ ان کی کوئی مستقل تصنیف نہیں تھی۔ یہ سید صاحب کی مستقل تصنیف ہی ہے جس میں صرف اجتہاد کی بحث وہ اپنی دوسری

مصروفیتوں کے سبب مکمل نہ کر سکے۔

مقصد تصنیف: مولانا سید سلیمان ندوی کے زمانے میں انگریزی تعلیم و تعلم کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا۔اس کا سب سے بڑا منفی اثر یہ تھا کہ مسلمان اپنی عظمت رفتہ کی داستان سے بے خبر بھی ہو رہے تھے اور یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کا ماضی بہت پرکشش نہیں ہے۔ چنانچہ اس وقت کے مصلحین کے سامنے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے جو منصوبے پیش نظر تھے ان میں اکابر اسلام کے حالات کو اس انداز سے مسلمانوں کے سامنے لانا بھی تھا کہ ان شخصیات سے دلچسپی بڑھے اور ان کو جاننے ،سمجھنے،اور پڑھنے کا شوق ان کے اندر پیدا ہو اور اس کے ذریعہ علوم اسلامیہ کی تاریخ بھی اور ضروری مسائل کی توضیح و تشریح بھی سامنے آجائے۔المامون،الفاروق،الغزالی،سوانح مولانا روم اور سیرۃ النعمان وغیرہ نے اس منصوبہ کی افادیت کو عام کر دیا تھا۔سید صاحب کی تحریریں اسی منصوبہ کا حصہ بنیں۔انہوں نے لکھا کہ:

> ''آج کل ملک میں علوم اسلامیہ کی طرف سے جو سرد مہری اور بے اعتنائی برتی جا رہی ہے اور جو انگریزی تعلیم کی وسعت کے ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے اس کی روک تھام کے لیے مصلحین کے سامنے مختلف صورتیں پیش ہیں۔منجملہ ان کے ایک صورت یہ ہے کہ ملک میں تاریخ کا مذاق کسی قدر پیدا ہو گیا ہے۔اکابر اسلام کی سوانح عمریوں کے پردے میں علوم اسلامیہ کی تاریخ لکھی جائے اور اس ضمن میں ضروری مسائل کی تشریح کی جائے۔''(۱۱)

موضوعات ومباحث: سید صاحب کے تصنیفی اوصاف میں سب سے بڑی صفت ان کا اعلیٰ محققانہ معیار ہے۔کوئی بات بلا تحقیق و تدقیق اور بغیر ثبوت وسند کے کہنا یا لکھنا ان کے عالمانہ ومحققانہ شعور کے منافی ہے۔۱۰۶ صفحات پر مشتمل ان کی اس پہلی کتاب کے موضوعات ومباحث سے ان کے اس مزاج کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔انہوں نے اس اولین تصنیف میں امام مالکؒ کے نام ونسب،اخلاق و عادات،تصنیفات اور وفات تک کی تفصیل بہم پہنچانے اور واقعات وسوانح کی جزئیات کا جس باریک بینی اور دقت نظر سے احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اس سے زیادہ کی توقع کم از کم آج کے سہل پسند محققین سے نہیں کی جاسکتی۔امام مالکؒ کی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو سید صاحب کی نظر تحقیق سے اوجھل رہ گیا ہو۔انہوں نے جس پہلو یا بحث کو لیا،وسعت مطالعہ اور استقصاء کی خوبی سے اس میں تجزیاتی رنگ شامل

کر دیا ہے۔ اگر کہیں قاری کے ذہن میں کچھ سوالات ابھرتے ہیں تو سید صاحب کا قلم پہلے ہی ان کے جوابات حاضر کیے دیتا ہے۔ مثال کے طور پر امام مالکؒ کا لقب ''امام دارالہجرہ'' ہے۔ اس لقب سے امام صاحب کیوں ملقب ہوئے؟ اس سوال کا جواب سید صاحب نے یہ دیا ہے:

''امام صاحب نے جب آنکھ کھولی تو مدینہ باغ و بہار تھا۔ باستثنائے چند یہ تمام بزرگوار درس و افتا میں مشغول تھے، امام نے اکثر سے استفادہ کیا اور اس طرح مدینہ کا جو علم متفرق سینوں میں پراگندہ تھا وہ اب صرف ایک سینہ میں مجتمع ہو گیا اور اسی لیے امام دارالہجرہ آپ کا لقب ہوا۔'' (۱۲)

امام دارالہجرۃ کا لقب کس نے دیا: یہ تو معلوم ہوا کہ امام صاحب کا یہ لقب کیوں ہوا؟ لیکن یہ امر اب بھی تحقیق طلب ہے کہ یہ لقب ان کو سب سے پہلے کس نے دیا۔ اس سلسلہ میں راقم سطور نے جو تحقیق کی ہے یہاں اس کو پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ایوبؒ بن سوید مشہور تابعی، امام مالک کے ہم عصر اور محدث تھے۔ ابن ابی عاصمؒ نے ان کی وفات ۲۰۲ھ میں بتائی ہے۔ امام بخاریؒ کا ان کی وفات کے بارے میں قول ہے کہ مجھ سے ابن اسحاق نے کہا کہ میں نے عبداللہ بن ایوب کو کہتے ہوئے سنا کہ ایوب بن سوید کی وفات ۱۹۳ھ میں غرق آب ہو کر ہوئی۔ (۱۳)

بزازؒ نے امام مالک کے متعلق ایوب بن سوید کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''میں نے امام مالک سے بہتر حدیث بیان کرنے والا نہیں دیکھا''۔ (۱۴) اور سب سے پہلے انہوں نے ہی امام مالک کو امام دارالہجرہ کہا۔ جیسا کہ صاحب ترتیب المدارک نے لکھا ہے:

''وقال ایوب بن سوید، مالك امام دار الهجرة'' (۱۵)

مدت حمل کی بحث: امام مالک کی پیدائش کے سلسلہ میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ شکم مادر میں تین برس رہے۔ صاحب سیر اعلام النبلا شمس الدین ذہبی لکھتے ہیں:

قال معن والواقدی ومحمد بن الضحاك حملت ام مالك بمالك ثلاث سنين و عن الواقدی قال حملت به سنتين (۱۶)	معن، واقدی اور محمد بن ضحاک کا کہنا ہے کہ امام مالک شکم مادر میں تین برس رہے۔ واقدی سے بھی یہ روایت ہے کہ دو سال رہے۔

ابن خلکان میں بھی امام مالک کی مدت حمل تین سال کا ذکر ہے، وحمل به ثلاث سنين۔(۱۷)

شاہ ولی اللہ مؤطا کی فارسی شرح کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

وبعضے گفتہ اند درنو دو حامل شد مادراو باو سہ سال۔(۱۸)　　　کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ شکم مادر میں تین سال رہے۔

سید صاحب نے اس پوری بحث کو غیر ضروری سمجھا اور اس کو واقدی کی غلط طبی جہالت کا نتیجہ قرار دیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''ابن سعد نے طبقات میں واقدی کی روایت سے بیان کیا ہے اور اسی کو اور لوگوں نے بھی نقل کیا ہے کہ امام مالک تین برس تک شکم مادر میں رہے لیکن واقدی کی یہ روایت اگر صحیح ہے تو غالباً اس کی غلط تعبیر طبی جہالت کا نتیجہ ہے۔ عورتوں کو بعض عوارض ایسے پیدا ہوجاتے ہیں جن سے کبھی حمل کے تمام آثار ان پر ظاہر ہوجاتے ہیں اور وہ مدت تک باقی رہتے ہیں۔ اسی اثنا میں حمل حقیقی ہوجاتا ہے۔ ناواقف لوگ اس تمام زمانہ کو مدت حمل سمجھ لیتے ہیں۔''(۱۹)

سید صاحب کی اس دلیل کی معنویت اپنی جگہ مگر یہ عارضہ ہے تو اس کی اور بھی مثالیں ہونی چاہیے تھیں۔ صرف والدہ مالک کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ بھی تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ روایت قرآن مجید کے بیان کے سراسر خلاف ہے۔ قرآن مجید نے ''وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا'' (۲۰) یعنی حمل سے دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے یعنی ڈھائی سال بتا کر واضح کر دیا کہ ماں کے پیٹ میں کوئی بچہ تین سال تک نہیں رہ سکتا۔

بعض اجلہ صحابہ اور شیوخ مدینہ سے عدم روایت کا سبب: امام مالک نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو علم کی آغوش میں پایا۔ گھر اور گھر سے باہر تمام شہر علما و فضلا کا مخزن تھا۔ تمام اکابر صحابہؓ جو علوم شریعت یعنی حدیث وفقہ کے امین اور قرآن وسنت کے واقف اسرار تھے اسی شہر میں مقیم تھے۔ اس تناظر میں مؤطا میں حضرت علیؓ اور حبر الامہ ابن عباسؓ جیسے اجلہ صحابہؓ اور بعض اہم شیوخ کی روایتوں کا نہ پایا جانا ایک سوال تو ہے۔ چنانچہ سید صاحب نے اس نکتہ پر غور کیا تو کتاب میں متعدد جگہوں پر خود امام مالک کی زبان قلم سے اس ضمن میں شہادتیں پیش کر کے اس سوال کا جواب حاضر کر دیا، لکھتے ہیں:

> ''امام مالکؒ نے نہ صرف انھیں اساتذہ فن سے اخذ کیا جو اہلیت واستحقاق کے

مسند نشین تھے اور صرف ان شیوخ کے حلقہ درس میں بیٹھے جو صدق وطہارت میں معروف اور حفظ وفقہ میں ممتاز تھے۔امام ممدوح ہمیشہ تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ میں کبھی کسی غیر فقیہ (سفیہ) کی مجلس میں نہیں بیٹھا......اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''اس صحن مسجد (نبوی) میں ان ستونوں کے پاس میں نے ستر شیوخ کو پایا جو قال رسول اللہؐ کیا کرتے تھے لیکن ان میں سے ایک کے پاس بھی نہیں بیٹھا'' کبھی فرماتے ''مدینہ میں بیسیوں اشخاص جن سے لوگ حدیث سیکھتے تھے لیکن میں نے ان سے کبھی اخذ علم نہیں کیا۔یہ چند قسم کے لوگ تھے بعض نادانستہ جھوٹ بولتے تھے۔بعض مغز سخن سے ناواقف تھے،بعض پورے جاہل تھے۔ ابن وہب جو امام صاحب کے نامور شاگرد ہیں ذکر کرتے ہیں کہ امام صاحب نے فرمایا کہ ''مدینہ میں ایسے کتنے مقدس لوگ تھے کہ اگر بارش کی دعا مانگی جاتی تو ان کی برکت سے آسمان سے پانی برس پڑتا اور بہت سے احادیث اور مسائل کی ان کو سماعت بھی حاصل تھی لیکن میں نے ان سے استفادہ نہیں کیا کیونکہ وہ صرف متقی وزاہد تھے اور یہ حدیث وروایت اور فتوی کا کام زہد واتقا اور سادگی سے نہیں چل سکتا۔اس کے لیے اتقا و پرہیز گاری کے ساتھ علم وفہم اور پختگی کی حاجت ہے۔وہ یہ جانتا ہو کہ اس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے؟ اور کل قیامت کے دن یہ معاملہ کہاں تک پہنچے گا؟۔جس زہد کے ساتھ پختگی اور دانائی نہ ہو وہ اس راہ میں مفید نہیں اور نہ وہ حجت ہے اور نہ ایسوں سے اخذ علم کرنا چاہیے۔'' (۲۱)

اسی طرح اہل عراق سے عدم روایت کے متعلق جب امام صاحب سے پوچھا گیا تو جواب دیا کہ ''وہ یہاں آکر ان لوگوں سے حدیث سیکھتے ہیں جن پر وثوق نہیں کیا جاسکتا۔'' (۲۲) فقہائے سبعہ میں سالمؒ بن عبداللہ اور سلیمانؒ بن یسار سے عدم روایت کا یہ سبب بیان فرمایا کہ ''مدینہ میں بعض لوگوں کا زمانہ میں نے پایا ہے کہ وہ ۱۰۰ برس، ۱۰۵ برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے لیکن ایسے بوڑھوں کی روایت نہیں لی جاتی ہے اور اگر کوئی لے تو عیب شمار کیا جائے گا۔'' (۲۳)

حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ سے عدمِ روایت کے متعلق ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''خلافت کے پہلے ہی سال (ہارون رشید) حج وزیارت کے لیے مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ آیا۔لوگ پیادہ استقبال وتہنیت کے لیے نکلے۔امام صاحب بھی محمل میں سوار ہوکر آئے۔ہارون رشید نے امام کودیکھ کرنہایت خوشی ظاہر کی اور کہا کہ'' آپ کی تصنیفات پہنچیں،خاندان کے نوجوانوں کوان کے مطالعہ کی تاکید کی ہے لیکن اس کا کیا سبب ہے کہ ہم نے ان میں ابن عباسؓ اور علیؓ ابن ابی طالب کی روایتیں نہیں پائیں''۔امام نے فرمایا کہ''اے امیرالمومنین! یہ دونوں بزرگوار ہمارے شہر میں نہ تھے''(۲۴)

امام مالک کی مسجد، جنازہ اور دوسری تقریبات میں عدم شرکت کی بحث: ابن خلکان نے واقدی کے حوالہ سے لکھاہے کہ ایک زمانہ میں امام مالک مسجد میں آتے۔نمازوں، جمعہ اور جنازوں میں حاضر ہوتے۔مریضوں کی عیادت کرتے۔حقوق ادا کرتے۔مسجد میں تشریف فرما ہوتے اور اصحاب ان کے پاس جمع ہوتے،بعد میں بیٹھنا چھوڑ دیا۔نماز پڑھ کر گھر واپس ہوجاتے۔جنازہ میں شرکت ترک کردی۔لیکن مرنے والوں کے اہل خانہ کے پاس تعزیت کے لیے جاتے تھے،پھر یہ سارے کام بھی چھوڑ دیے۔مسجد اور جمعہ میں حاضری چھوڑ دی۔کسی کے پاس تعزیت کے لیے بھی نہیں جاتے۔لوگوں کے حقوق کا فیصلہ نہیں کرتے۔بعض لوگوں کو یہ طرزعمل سمجھ میں نہیں آیا۔جب اس بارے میں ان سے پوچھا گیا تو فرمایا ہر شخص اس پر قادر نہیں کہ وہ اپنا عذر بیان کرے۔

''فیقول لیس کل الناس یقدر ان یتکلم بعذرہ''۔(۲۵)

صاحب سیر اعلام النبلاء نے محمد بن سعد کے حوالہ سے چند الفاظ کے فرق کے ساتھ اسی قسم کی روایت نقل کی ہے۔(۲۶)

امام صاحب کی زندگی کا یہ اہم پہلو ہے۔جس سے یہ سوال تو پیدا ہی ہوتا ہے کہ آخر امام مالک نے یہ طرزعمل کیوں اختیار کیا؟ اگر روایت صحیح نہیں ہے تو سید صاحب ضرور تحقیق وتنقید کرتے لیکن سید صاحب کے بیان کے مطابق اس کی وجہ امام صاحب کی درازی عمر کے سبب ضعف وناتوانی ہوسکتی ہے لیکن اوپر واقدی اور ابن سعد کے جو بیانات نقل ہوئے ہیں ان سے ایسا نہیں لگتا کہ انہوں نے یہ عمل اواخر زندگی میں ضعف وناتوانی کے سبب اپنایا تھا۔بہرحال سید صاحب نے اس ضمن میں جو

معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ اس طرح ہیں:

"امام صاحب کی عمر شریف اب ۸۱ برس کو پہنچ چکی تھی ،نہایت ضعیف اور ناتواں ہو گئے تھے۔مسجد نبویؐ میں آنا،نماز جماعت میں شریک ہونا اور ادھر ادھر غم وشادی کی تقریبوں میں آنا جانا تو پہلے سے ترک ہو گیا تھا۔لوگ اعتراضات کرتے تھے تو فرماتے کہ "ہر شخص اپنا عذر نہیں بیان کر سکتا۔" (۲۷)

تاہم امام صاحب نے بایں مجبوریِ حالات درس وافتا کی خدمت جاری رکھی تھی۔سید صاحب نے امام صاحب کے بعض تلامذہ کے حوالہ سے لکھا ہے:

"معن بن عیسیٰ المتوفی ۱۹۸ھ جو امام کے عزیز ترین شاگرد تھے اور جو صحاح کے رواۃ میں داخل ہیں۔وہ اس وقت امام کے خادم تھے۔امام صاحب انہی کا سہارا پکڑ کر چلتے تھے لیکن اس ضعف و ناتوانی کے عالم میں بھی درس و افتا کی خدمت جاری رکھی تھی۔" (۲۸)

گویا امام مالکؒ کے نزدیک سب سے ضروری اور اہم کام جو انہوں نے انتہائی ضعف وناتوانی کے عالم میں بھی نہیں چھوڑا وہ درس وتدریس اور لوگوں کو مسائل دین سے آگاہ کرنا تھا تا کہ شمع شریعت کی لو کسی بھی حال میں مدھم نہ ہو اور جو لوگ حصول علم اور استفادہ کے لیے حاضر ہوں وہ محروم نہ رہیں تو آخر اجتماعی ومعاشرتی کاموں کو کیوں ترک کر دیا؟

بہر حال ان کے اعتذار کے متعلق ایک روایت میں ہے کہ "امام مالکؒ نے آخر میں بتایا کہ مجھے سلسل البول کی شکایت ہے۔میں اس حالت میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانا نہیں چاہتا کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم وتکریم میں فرق آئے اور میں نہیں چاہتا کہ اپنی بیماری کا تذکرہ کر کے اللہ سے شکوہ کروں۔" (۲۹)

طلاق مکرہ کے متعلق امام مالک کا فتویٰ: طلاق کے سلسلہ میں ایک بحث یہ ہے کہ اگر کسی نے بجبر واکراہ طلاق دی تو واقع ہوئی کہ نہیں۔اس سلسلہ میں دونوں قسم کی رائیں ہیں۔بعض کے نزدیک واقع ہو جائے گی اور بعض عدم وقوع کے قائل ہیں۔امام مالک کے نزدیک واقع ہو جائے گی۔سید صاحب نے اس ضمن میں تاریخی اور فقہی دونوں قسم کی معلومات بہم پہنچائی ہے اور لکھا ہے کہ امام مالک کو اس

سلسلہ میں اپنے موقف پر جمے رہنے کی سزا بھی دی گئی۔سید صاحب امام مالک کی طرح خود عدم وقوع کے قائل ہیں اور اس مسئلہ کے متعلق انہوں نے اپنے استاد سے جو مناظرہ کیا تھا اس کی تفصیل بھی نقل کی ہے۔ یہ دلچسپ بحث سید صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

> ”اگر کوئی شخص زبردستی مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور اس نے ڈر کر بجبر واکراہ دیدی تو امام ابوحنیفہؒ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک طلاق واقع ہوجائے گی لیکن امام صاحب اور اکثر اصحاب حدیث اس کے قائل ہیں کہ طلاق واقع نہ ہوگی۔والی مدینہ جعفر بن سلیمان عباسی جو خلیفہ منصور کا چچازاد بھائی بھی تھا اس نے امام کو حکم دیا کہ وہ یہ فتوی نہ دیں لیکن امام صاحب نے علی الاعلان اپنی رائے کا اظہار کیا اور آخر میں اس کے لیے کوڑوں کی سزا گوارہ کی۔“

سید صاحب نے اس ضمن میں اپنے استاد سے اپنے مناظرہ کی تفصیل پیش کر کے اس بحث کو مزید توجہ کی مستحق بنا دیا ہے۔یہاں اس کا خلاصہ اس لیے پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خود سید صاحب کے عہد طالب علمی میں کسی فقہی مسئلہ پر غور وفکر کے انداز اور ان کی جودت وابتکار طبع کا علم ہوتا ہے، لکھتے ہیں:

> ”طلاق مکرہ کے مسئلہ میں ہماری جماعت میں اختلاف ہوا۔میرے سوا تمام طلبہ وقوع کے قائل تھے میں حضرت عائشہؓ کی حدیث لا طلاق ولا عتاق فی اغلاق (حالت جبر واکراہ میں طلاق وعتاق نہیں) پیش کرتا تھا اور ان کی طرف سے ثلاث جدھن وھزلھن سواء (۳۰) (تین چیزوں میں اظہار واقعیت اور مذاق دونوں برابر ہیں) کی حدیث پیش کی جاتی تھی، میں کہتا تھا، طلاق مکرہ نہ جد (واقعیت) ہے نہ ہزل (مذاق) ہزل تو متفقاً نہیں ہے۔”جد“ اس لیے نہیں کہ ”جد“ نام ہے خواہش حقیقی و واقعی کے اظہار کا جو بحالت اکراہ غیر ممکن ہے بالآخر یہ معاملہ جناب مفتی صاحب (مولانا عبداللطیف) کی خدمت میں پیش کیا گیا۔مفتی صاحب نے استدلال عقلی کے طور پر فرمایا: زبان سے لفظ طلاق ادا کرنا انسان کا ایک فعل ہے اور افعال کا اثر محتاج نیت وارادہ اظہار واقعیت نہیں ہے۔مثلاً اگر کسی کو تم ایک طمانچہ مارو جو تمہارے ہاتھ کا

ایک فعل ہے تو اس کا اثر چوٹ اور صدمہ محسوس و واقع ہوگا خواہ مارنے کے لیے تمہارا ارادہ وخواہش واقعی ہو یا نہ ہو۔اسی طرح لفظ طلاق کے نطق کا جواثر ہے وہ ہر حال میں واقع ہوگا۔اس استدلال کو سن کر میں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا لیکن فی الفور خدا نے مجھے ایک حجت القا کر دی۔میں نے عرض کیا کہ افعال کے آثار دو قسم کے ہیں: اعتباری و واقعی۔واقعی وہ جو ہماری تسلیم واعتبار پر موقوف نہ ہو بلکہ حقیقۃً بلا اعتبار معتبر ہو، مثلاً ضرب کے لیے احساسِ صدمہ، دوسرا صرف اعتباری۔اگر اعتبار کیجئے تو اثر ہے اور نہ اعتبار کیجئے تو اثر نہیں ہے۔مثلاً ایک مجنوں کی لفظ طلاق کے ساتھ حرکت زبان، اگر شرع اعتبار کرے تو طلاق ہے نہ اعتبار کرے تو طلاق نہیں ہے۔اس لیے باعتبار عقلی کے صرف یہ ثابت کرنا چاہیے کہ مکرہ کے اس فعل کے اثر کو شریعت اعتبار کرتی ہے یا نہیں اور اس کا فیصلہ حدیثِ عائشہ نے کر دیا کہ نہیں کرتی۔‘‘(۳۱)

مؤطا کی بحث: سید صاحب نے امام مالک کی تصنیفات کا تذکرہ کیا ہے اور بشمول مؤطا بارہ تصنیفات کے نہ صرف نام شمار کرائے ہیں بلکہ ان سب کا مجملاً تعارف بھی کرا دیا ہے، البتہ مؤطا جو امام مالک کا طغرائے امتیاز اور شاہکار ہے اس پر بڑی پر مغز اور ناقدانہ بحث کی ہے۔سید صاحب کی تحقیق کے مطابق مؤطا قرآن پاک کے بعد کتب خانہ اسلام کی دوسری کتاب ہے۔(ص ۹۴) امام مالک کے شاگرد امام شافعیؒ کا مؤطا کے متعلق قول ہے۔’’ما فی الارض کتاب من العلم اکثر صوابا من مؤطا مالک‘‘ روئے زمین پر مؤطا سے صحیح کوئی کتاب نہیں‘‘۔(۳۲) مؤطا کی تالیف کب اور کیوں ہوئی؟ مؤطا سے پہلے تدوین احادیث کی کیا صورت حال تھی؟ سید صاحب کہتے ہیں کہ ۱۳۳ھ ایک نئے دور کی بنیاد ہے۔خلافت امویہ مٹ کر خلافت عباسیہ قائم ہوتی ہے۔اسی کے پس و پیش عہد میں سینکڑوں مجموعہ ہائے حدیث مدون ہوئے اور مؤطا کی تالیف کا بھی یہی زمانہ ہے۔(ص ۹۵) امام مالک نے مؤطا خلیفہ منصور کے حکم سے شروع کی (ص ۹۷) جب یہ خبر عام ہوئی تو مدینہ کے اور علماء نے بھی مجموعہ احادیث تیار کرنا شروع کر دیا لیکن سید صاب کے بقول ’’مؤطائے مالک کے سوا کوئی مؤطا دنیائے معلوم میں باقی نہیں رہی۔‘‘(ص ۹۷)۔جب امام مالک کی طرف سے شیوخ مدینہ کے سامنے مؤطا پیش کی گئی تو سب نے اس کو نہایت پسند کیا اور اس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

وجہ تسمیہ کے متعلق سید صاحب لکھتے ہیں کہ ”موطا وہ پامال راستہ ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد تمام صحابہ گذرے۔غرض موطا کا لفظ اپنی حقیقت کا آپ مفسر ہے کہ یہ ان مسائل پر مشتمل ہے جن پر صحابہ کا عمل رہا ہے اور جمہور سلف جن پر چلے ہیں (ص۹۹)۔مرویات کی کل تعداد ۱۷۲۰ ہے جن میں سے مسند اور مرفوع ۶۰۰، مرسل ۲۳۵، موقوف ۶۱۳، تابعین کے اقوال وفتاوی ۲۸۵، امام مالکؒ کے بلاغات ۵ ہیں۔(ص۹۹) ان کی اس تحقیق کا مرجع شاہ ولی اللہ کی المصفی ہے۔

مسانید اربعہ میں موطا کی فوقیت: ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک کے انتساب سے حدیث کا ایک مجموعہ موجود ہے لیکن سید صاحب نے تمام مسانید کی حقیقت بتاتے ہوئے موطا کی ان پر فوقیت کی نشاندہی یہ کی ہے کہ ”امام مالک کے سوا کسی امام مجتہد کے قلم سے علم حدیث کی کوئی تصنیف ظاہر نہیں ہوئی۔“ (ص۱۰۰) ان کے مطابق مسند ابوحنیفہؒ کو سینکڑوں برس بعد محمد بن یعقوب اور حسین بن محمد بن خسرو نے، مسند امام شافعی کو ابوجعفر بن محمد بن مطر نیشاپوری یا ابوالعباس نام شافعی نے تالیف کی اور مسند احمد بن حنبل کی تالیف خود امام نے شروع کی تھی مگر ان کی وفات ہوگئی۔بعد کو ان کے صاحبزادے عبداللہ نے تبییض وترتیب دی۔(ص۱۰۰) اس لیے اس کو بجائے مسند احمد کے مسند عبداللہ کہنا چاہیے اور بایں ہمہ اس میں صحیح احادیث کا التزام نہیں ہے جیسا کہ ناقدین حدیث جانتے ہیں۔(ایضاً)

موطا کے امتیازی اسباب: سید صاحب کا خیال ہے کہ بیسیوں موطائیں اور مسانید لکھی گئیں جن میں سے بعض اب بھی ہیں لیکن وہ یا تو دوسری کتابوں میں ضم ہوکر اپنا وجود کھو بیٹھیں یا پھر ان کو وہ شہرت حاصل نہ ہوسکی جو موطا کو حاصل ہوئی۔سید صاحب کے نزدیک اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ موطا سے پہلے حدیث کی جو کتابیں لکھی گئیں اس کی بنیاد صحابہ کے فتاوی وآثار پر تھی لیکن موطا میں احادیث صحاح و مسند یا مرسل کو پہلی اور آثار وفتاوی کو دوسری بنیاد قرار دیا گیا، دوسری وجہ موطا میں صرف صحیح حدیث یا فتوی نے جگہ پائی اور تیسری وجہ موطا کے رواۃ حجازی ہیں اور اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ حجاز کی حدیثیں صحت،، قوت اور جودت اسناد میں سب پر فائق ہیں۔(ص۱۰۱)

موطا کا مقام ومرتبہ: موطا کے سلسلہ میں سید صاحب کی بحث وتحقیق کا ایک پہلو طبقات کتب حدیث میں اس کے مقام ومرتبہ کا تعین بھی ہے۔علمائے حدیث نے کتب حدیث کو چار مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے۔طبقہ اولی میں صحت، جودت اسناد اور قبول محدثین کے لحاظ سے سب سے مقدم

ائمہ ونقادان فن حدیث کی کتابیں ہیں اور جن کے رجال حفظ وثبوت اور شہرت میں معروف ہیں۔
طبقہ ثانیہ میں اس سے کم درجہ، اس کے بعد اس سے کم، اس کے بعد اس سے کم درجہ کے محدثین اور کتابیں
ہیں۔ سید صاحب کے بیان کے مطابق طبقہ اولی میں مؤطا، بخاری اور مسلم ہیں اور طبقہ ثانیہ میں ترمذی،
ابوداؤد اور نسائی۔ اور ان دونوں طبقات کو صحاح ستہ کہتے ہیں۔ ابن اثیر جزری نے صحاح ستہ میں انہی
چھ کتابوں کو شامل کیا ہے۔ (ص ۱۰۲)

سید صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض علمائے حدیث طبقہ اولی تو درکنار طبقہ ثانیہ میں بھی
ترمذی کے بھی بعد مؤطا کو جگہ دیتے ہیں۔ لیکن قدما اور متاخرین میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز اور
خود وہ بھی مؤطا کو بخاری سے بھی مقدم سمجھتے ہیں (ص ۱۰۲) بخاری ومسلم کو فوقیت کثرت روایات، کثرت
مرفوعات اور مرسل وموقوف حدیثوں سے پاک ہونے کی بنا پر ہے اور مؤطا میں اس قسم کی حدیثیں زیادہ
ہیں جو قادح صحت ہیں لیکن سید صاحب کا کہنا ہے کہ ان کا ارسال، وقف اور انقطاع مؤطا کی روایت
کے لحاظ سے صحیح ہے اور خود امام بخاری، مسلم اور ترمذی وغیرہ کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے۔ (ایضاً) اس
کے بعد سید صاحب نے مؤطا کی فضیلت پر مشتمل بعض نامور محدثین وائمہ قاضی ابوبکر ابن عربی،
سفیان ثوری، امام شافعی وغیرہ کے بیانات نقل کیے ہیں کہ مؤطا کو تاریخ اسلام کی پہلی کتاب ہونے کا
شرف حاصل ہے۔ دوسرے اس کے بعد کی کتابیں مؤطا کی نقش ثانی ہیں۔ تیسرے مؤطا کے راویوں
کا مقام ومرتبہ دوسری کتب احادیث کے راویوں سے اونچا ہے۔ چوتھے مؤطا کے رواۃ کی تعداد جتنی
زیادہ ہے کسی دوسرے امام کے رواۃ کی نہیں ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مؤلف
حدیث میں جتنے واسطے کم ہوں گے اسی قدر اس کی تالیف زیادہ معتبر ہوگی۔ بخاری ومسلم کی رواتیں عموماً
پانچ یا چھ واسطوں سے ہوتی ہیں اور مؤطا کی حدیثیں دو تین واسطوں سے زیادہ کی نہیں ہیں۔ بخاری کو
اپنے بیس ثلاثیات پر ناز ہے اور مؤطا کی بنیاد ہی ثلاثیات پر ہے۔ علاوہ ازیں مؤطا میں چالیس ثنائیات
ہیں یعنی جن میں امام مالکؒ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان صرف دو واسطے ہیں''۔ (ص ۱۰۵)

مؤطا کا مقام ومرتبہ اپنی جگہ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض محدثین نے صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کو
شامل کیا ہے۔ ان کے نزدیک مؤطا اس میں شامل نہیں ہے۔ سید صاحب کے سامنے یہ بحث ضرور
رہی ہوگی لیکن انہوں نے اس اہم بحث کو قلم انداز کر دیا ہے۔ مؤطا کو صحاح میں شامل نہ کرنے والے

محدثین نے اس کے متعدد اسباب بتائے ہیں یہاں ان کی تفصیلات کا موقع نہیں البتہ جو بات بہت مشہور و معروف ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ موطا میں صحیح احادیث کے ساتھ ساتھ امام مالک کے ذاتی اقوال و فتاوی اور آثار صحابہ بھی شامل ہیں جو ان محدثین کے مجوزہ اصول وضوابط کے خلاف ہے۔ دوسرے امام تمام احادیث صحابہ کرامؓ سے روایت نہ کر سکے اور یہ کسی فرد واحد کے لیے ممکن بھی نہیں تھا۔ تاہم اس کے باوجود موطا کو بالعموم محدثین نے حدیث کی صحیح ترین کتابوں میں شمار کیا ہے۔

"حیات امام مالکؒ" کے مآخذ: سید صاحب کی یہ پہلی کتاب کیفیت یعنی ضخامت کے لحاظ سے کم ہے لیکن کمیت یعنی معنویت، افادیت اور اہمیت کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے اس کی تصنیف میں جس محنت اور تحقیق و جستجو کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اس کا اندازہ کتاب کے مآخذ پر نگاہ ڈالنے سے ہو جاتا ہے۔ حیرت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب معلوم ہوتا ہے کہ ۲۳ سالہ جوان رعنا نے الاصابہ فی تمییز الصحابہ، تزئین الممالک، سیوطی، تاریخ ابن خلکان، اسعاف المبطاء برجال الموطا، سیوطی، تذکرۃ الحفاظ، ذہبی، کتاب الانساب، سمعانی، طبقات ابن سعد، کتاب العلل ترمذی، جامع بیان العلم، توالی التاسیس بمناقب ادریس، ابن حجر، مناقب مالک، ابن سعود الزواوی، تقریب التہذیب، مقدمہ ابن الصلاح، مقدمہ اعلام الموقعین، ابن قیم، الاخبار الطوال، ابوحنیفہ دینوری، تاریخ ابن خلدون، کتاب الفہرست، ابن ندیم، کشف الظنون، مرأۃ الجنان، تہذیب الکمال، طبقات السبکی، کتاب الامامہ و السیاسہ، مقدمہ شرح مسلم، امام نووی، کتاب الذبائح، دارقطنی، النکت، زرکشی مرات الاوراق، ابن حجہ حموی، اعلام الاعلام، عبدالکریم مکی، فتح المغیث، بستان المحدثین، شاہ عبدالعزیز، المصفی، مقدمہ مسوی، شاہ ولی اللہ دہلوی، محلی شرح موطا، مولانا عبدالسلام حنفی، رواۃ مالک للخطیب، مسند ابوحنیفہ، ابوالضیاء، اکمال الاکمال شرح زرقانی وغیرہ جیسے عربی کے مستند مآخذ کے صفحات کھنگالے ہیں اور عطر کشید کر کے اہل علم کے مشام جاں کو معطر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کتابوں میں بعض نام ایسے بھی ہیں جن سے یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ ان میں امام مالکؒ کے حالات کا تذکرہ ہوگا لیکن سید صاحب نے ان میں سے بھی امام مالکؒ کی علمی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کا استنباط کرلیا ہے۔ یہ سید صاحب کے وسعت مطالعہ اور مآخذ پر ان کی مضبوط گرفت و دسترس کا نتیجہ ہی تھا۔

البتہ راقم تہی مایہ کو اس کتاب کی تخریج و مراجعت کرنے کے سبب یہ کہنے کا حق حاصل ہے

کہ حوالوں کے اس اہتمام کے باوجود سید صاحب کے بعض محولہ حوالہ تلاش بسیار کے بعد بھی نہ مل سکے، مثال کے طور پر ص ۱۴ پر سید صاحب نے طبقات ابن سعد کے حوالہ سے واقدی کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ''امام مالک تین برس تک شکم مادر میں رہے۔'' لیکن طبقات ابن سعد تذکرہ مالک میں یہ حوالہ مراجعت کے بعد نہ مل سکا۔ ص ۱۹ پر نافع کے متعلق سید صاحب نے لکھا ہے کہ ''امام مالک ان سے پوچھتے کہ ان مسائل میں حضرت ابن عمرؓ نے کیا فرمایا ہے؟ نافع ان کے اقوال بیان کرتے تھے۔'' سید صاحب نے ''طبقات ابن سعد جزء تابعین مدینہ ترجمہ مالک'' کا حوالہ دیا ہے لیکن مراجعت کے بعد یہ روایت محولہ مقام پر نہ مل سکی۔ یہ روایت اسعاف المبطا برجال المؤطا ص ۳۸ پر موجود ہے۔ اسی طرح ص ۷۴ پر سید صاحب کی نشان دہی کے مطابق ذہبی کے اس قول ''وحدث عنه امم لا يكادون يحصون'' کا حوالہ تقریب التہذیب تذکرہ ''مالک بن انس'' میں تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکا۔ سید صاحب نے مقدمہ ابن صلاح کے باب ۲۹ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ''حیات نبویؐ میں مسلمانوں کی تعداد کم و بیش ۶۰ ہزار سے ایک لاکھ تک تھی۔ ان میں سے تیس ہزار خاص مدینہ میں متوطن تھے۔'' (ص ۵۴) لیکن یہ حوالہ بھی غلط ہے۔ مقدمہ کا انتیسواں باب ''معرفۃ الاسناد العالی والنازل'' کے عنوان سے ہے جس میں سندوں کے متعلق محدثین کے اقوال نقل کیے گئے ہیں صحابہ کی تعداد کا ذکر نہیں ہے۔

استفادہ کے باوجود ''حیات امام مالک'' کا حوالہ نہ دینا: اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اردو میں امام مالکؒ کے سوانح پر سید صاحب کی یہ پہلی کتاب ہے۔ اسی سے ہندوستان میں مالک شناسی کا آغاز ہوتا ہے۔ سید صاحب کے بعد ائمہ اربعہ کے حالات پر جو بھی کتابیں لکھی گئیں ان میں اس کتاب سے یقیناً استفادہ کیا گیا لیکن اسی کے ساتھ اس افسوس ناک حقیقت اور حیرت انگیز واقعہ کا تذکرہ ضروری ہے کہ استفادہ کے باوجود بعد میں لکھی جانے والی بعض تصانیف میں سید صاحب کی ''حیات امام مالک'' کا حوالہ ایک جگہ بھی نظر نہ آیا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ان مصنّفین اور صاحبان علم و تحقیق نے اپنی اپنی کتابوں میں امام مالک کی حیات علمی و فقہی کے بہت سے نئے گوشوں اور پہلوؤں کا انکشاف کیا اور تحقیق و جستجو کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی علمی صلاحیت و لیاقت میں بھی کوئی شبہہ نہیں۔ تاہم جب ان کتابوں میں ہو بہو وہی جملے اور عبارتیں نظر آئیں جو ''حیات امام مالک'' میں پہلے آ چکی ہیں اور عربی عبارتوں کے وہی ترجمے دکھائی دیں جو سید صاحب کے ہیں اور سید صاحب کا حوالہ نہ دیا جائے اور

اگر دیا بھی جائے تو سید صاحب کے بجائے اصل مأخذ سے دیا جائے تو اس سے بڑا ظلم حیات امام مالک کے ساتھ اور کیا ہوگا۔ ذیل میں بطور مثال چند اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

اقتباس حیات امام مالک (ص ۳۴،۳۵)

۱۔امام ممدوح ہمیشہ تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ میں کبھی کسی غیر فقیہ (سفیہ) کی مجلس میں نہیں بیٹھا۔امام ابن حنبل فرماتے ہیں کہ ''یہ مخصوص نعمت تھی جو صرف حضرت امام مالک کے حصہ میں آئی''امام صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''(اس صحن مسجد نبویؐ) میں ان ستونوں کے پاس میں نے ستر شیوخ کو پایا جو قال رسول اللہ قال رسول اللہ کیا کرتے تھے لیکن میں ان میں سے ایک کے پاس بھی میں نہیں بیٹھا'' کبھی فرماتے ''مدینہ میں بیسیوں اشخاص تھے جن سے لوگ حدیث سیکھتے تھے لیکن میں نے کبھی ان سے اخذ علم نہیں کیا۔''

۲۔اگر کوئی شخص زبردستی مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور اس نے ڈر کر بجبر واکراہ دے دی تو امام ابوحنیفہؒ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک طلاق واقع ہوجائے گی لیکن امام مالکؒ اور اکثر اصحاب حدیث اس کے قائل ہیں کہ طلاق واقع نہ ہوگی، والیِ مدینہ جعفر بن سلیمان عباسی جو خلیفہ منصور کا چچازاد بھائی بھی تھا، اس نے امام کو حکم دیا کہ وہ یہ فتوی نہ دیں لیکن امام صاحب نے علی الاعلان اپنی رائے کا اظہار

اقتباس ''ائمہ اربعہ، حیات اور علمی و فقہی خدمات'' (ص ۳۸۴)(۳۳)

۱۔''وہ تحدیث کے نعمت کے طور پر خود فرمایا کرتے تھے میں کبھی کسی غیر فقیہ (سفیہ) کی مجلس میں نہیں بیٹھا۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ یہ مخصوص نعمت امام مالک کے حصے میں آئی، امام مالک کا بیان ہے کہ میں نے مسجد نبویؐ کے ان ستونوں کے پاس ستر ایسے شیوخ کو پایا جو قال رسول اللہ قال رسول اللہ کہا کرتے تھے لیکن ان میں سے کسی کے پاس نہیں بیٹھا۔کبھی فرماتے مدینہ میں بیسیوں اشخاص تھے جن سے لوگ حدیث سنتے تھے لیکن میں نے کبھی ان سے اخذ علم نہیں کیا۔''

۲۔اگر کوئی شخص زبردستی مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے اور اس نے خوف زدہ ہو کر اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو امام ابوحنیفہؒ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک طلاق واقع ہوجائے گی لیکن امام مالک اور اکثر اصحاب حدیث اس کے قائل ہیں کہ طلاق واقع نہ ہوگی (حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے: لاطلاق ولا عتاق فی اغلاق یعنی حالت جبر واکراہ میں طلاق وعتاق نہیں) والی مدینہ جعفر بن سلیمان عباسی نے امام صاحب کو حکم

کیا اور آخر اس کے لیے کوڑوں کی سزا تک گوارا کی۔ (ص ۵۸، ۵۹)	دیا کہ وہ یہ فتویٰ نہ دیں لیکن امام صاحب نے علی الاعلان اپنی رائے کا اظہار کیا اور آخر اس کے لیے کوڑوں کی سزا تک گوارہ کی‘‘۔(ص ۴۰۹، ۴۱۰)

اس کے علاوہ ’’خلیفہ منصور کی معذرت، خلیفہ منصور کی بے وقت طلبی (ص ۳۷۳) محمد المہدی (ص ۳۷۴۔۳۷۵) خلیفہ ہارون رشید اور امام دار الہجرہ (ص ۳۷۵) منبر رسول (ص ۳۷۷) اور موؤطا کو خانہ کعبہ پر لٹکانے کی تجویز (ص ۳۷۷۔۳۷۸) وغیرہ سرخی کے تحت اردو میں جو معلومات ہیں وہ چند ایک لفظ کو چھوڑ کر اسی طرح ہیں جیسے حیات امام مالک میں ہیں۔ مگر حوالہ عربی ماخذ یعنی کتاب الامامہ اور تزئین الممالک وغیرہ کا دیا گیا ہے۔

حیات امام مالکؒ کا ادبی پہلو: سید صاحب کی اس کتاب کا انتہائی جاذب نظر اور پرکشش پہلو اس کا ادبی رنگ و آہنگ ہے۔ اس کے ایجاز، اس کی سادہ وشستہ اور سلیس وروان نثر، اس کی خوبصورت تعبیر، حشو و زوائد اور دقیق الفاظ سے پاک اس کے جملے، پرُ زور قوت استدلال، پر وقار اور محققانہ اسلوب اور متانت تحریر کے نمونے اس کتاب میں جا بجا بکھرے ہیں۔ یہ سید صاحب کا ذوق ادب ہی تھا جس نے اس خشک موضوع میں بھی ادب کی چاشنی بھر دی ہے اور قاری مطالعہ کے دوران جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا ہے امام مالک کے حالات جاننے کا شوق بھی بڑھتا جاتا ہے، سید صاحب نے اپنے دلنشین طرز تحریر سے قاری کو اپنے سے الگ نہیں ہونے دیا ہے۔ سید صاحب کی اس پوری کتاب میں ایک لفظ بھی ایسا نہ ملے گا جس میں سوقیانہ پن کا شائبہ تک پایا جاتا ہو۔ اس کتاب کے ماخذ عربی ہیں لیکن ترجموں میں ایسی روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے کہ اصل کا گمان ہوتا ہے۔ بعض جگہوں پر اپنے زور قلم سے ایسے مناظر پیش کیے ہیں کہ پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ بے جا مداحی، مبالغہ آرائی کو کہیں بھی راہ نہیں دی ہے۔ یہ کتاب معروضی مطالعہ کی مثال بھی پیش کرتی ہے لیکن تجزیہ کے وقت بھی ان کا قلم دامنِ ادب ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ درج ذیل چند اقتباسات میں ہمارے ان خیالات کی صداقت اور جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

امام مالک کی پیدائش کے وقت عالم اسلام کی کیفیت کیا تھی؟ اور اس وقت اسلام کا دائرہ اثر کن ممالک اور علاقوں تک پہنچ چکا تھا، اس پوری تاریخ کو سید صاحب نے چند جملوں میں سمیٹ دیا ہے:

''امام ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے تھے، اس لحاظ سے امام مالک ان سے عمر میں ۱۳ برس چھوٹے تھے۔ اس وقت بنی امیہ کی حکومت کا اوج شباب تھا، ولید بن عبدالملک جو اموی مروانی حکومت کا تیسرا تاجدار تھا، سریر آرائے خلافت دمشق تھا، فتوحات اسلامیہ کا سیلاب مشرق میں ترکستان، کابل اور سندھ کو عبور کر چکا تھا اور مغرب میں افریقہ اور اسپین کی سرزمینوں میں موجیں لے رہا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس عہد میں امام پیدا ہوئے اس کا تاجدار جس سرزمین کو تلوار سے فتح کر رہا تھا، امام کے قلم نے سب سے زیادہ وہیں قبضہ حاصل کیا یعنی طرابلس، ٹیونس، الجزائر، مراکش اور اسپین میں'' (ص ۱۴)۔

امام مالک کی مجلس درس کی نوعیت، اس کے آداب اور اس کی تہذیب و حضارت کی مرقع آرائی اس طرح کرتے ہیں:

''امام صاحب کی مجلس درس ہمیشہ پُر تکلف فرش اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ رہتی تھی۔ وسطِ مجلس میں شہ نشین تھی، جس پر امام صاحب املائے حدیث کے موقع پر رونق افروز ہوتے تھے، جا بجا شرکائے مجلس کے لیے پنکھے پڑے رہتے تھے، جب حدیث کا درس ہوتا تو مجمر میں عود اور لوبان جلایا جاتا، صفائی و نزاہت کا یہ عالم ہوتا کہ فرش پر ایک تنکا بھی بار خاطر ہوتا۔'' (ص ۴۰۔۴۱)

درس کے وقت کا نقشہ ملاحظہ فرمائیں:

''تمام لوگ سرنگوں، خاموش، مؤدب بیٹھتے تھے، یہاں تک کہ امام ابوحنیفہؒ بھی جب امام کی مجلس درس میں آ کر شریک ہوتے تو وہ بھی مؤدب ہو کر بیٹھتے۔ اس وقت امام صاحب کی ادا سے شکوہ اور وقار کا اظہار ہوتا تھا۔ تمام مجلس پر ایک مقدس سکوت طاری رہتا...... جاہ و جلال اور شان و شکوہ سے کاشانہ امامت پر بارگاہ شاہی کا دھوکہ ہوتا تھا، طلبہ کا ہجوم، مستفتیوں کا اژدہام، امرا کا ورود، علماء کی تشریف آوری، سیاحوں کا گزر، حاضرین کی مؤدب نشست، درِ خانہ پر سواریوں کا انبوہ، دیکھنے والوں پر رعب و وقار طاری کر دیتا تھا''۔ (ایضاً)

امام صاحب کے درس کی شہرت ہوئی تو مشرق و مغرب کے طالبانِ علوم حدیث نے مدینہ کا رخ کیا۔ سید صاحب نے یہ واقعہ درج ذیل ادبی رنگ میں لکھا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''ایک تو مدینہ خود اسلام کا گہوارہ اور نسلاً بعد نسلٍ علم دین کا مرکز تھا۔ دوسرے یہ کہ امام ہمام کا خاندان ابتدا سے علم کے ساتھ ایک خاص نسبت رکھتا تھا۔ ان اضافی اوصاف کے ساتھ خود ذاتی جوہر نے وہ پر و بال نکالے کہ دنیائے اسلام مشرق سے مغرب تک امام کے آوازۂ شہرت سے معمور ہوگئی اور امام کی درسگاہ اختلاف مرزِ بوم کی بوقلموں زار بن گئی، ایک طرف سیستان دوسری صدی کی مملکت اسلام کا مشرقی گوشہ اور دوسری طرف قرطبہ دنیائے اسلام کا مغربی گوشہ۔ دونوں کے ڈانڈے مدینۃ الرسول کی سرحد میں آ کر مل گئے۔'' (ص ۸۰)

امام صاحب کے واقعۂ وفات کی تصویرکشی پرکون ہے جس کی آنکھیں پڑھ کر نم نہ ہو جائیں:

''اتوار کے روز بیمار پڑے اور تقریباً تین ہفتے تک بیمار رہے۔ مرض کی شدت میں کوئی تخفیف نہ ہوئی۔ لوگوں کو یقین ہوگیا کہ اب وقت آخر ہے۔ مدینہ کے تمام علما و امرا آخری دیدار کے لیے جمع ہو گئے...... تلامذہ کے علاوہ حدیث وفقہ کے ۱۶۰ علما مؤدب با چشم گریاں آس پاس بیٹھے تھے۔ جسم کی حرارت آہستہ آہستہ سرد ہو رہی تھی .... گریہ جاری تھا۔ لب متحرک تھے کہ مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ اب بھی اسی طرح اردگرد طلبہ و علما کا ہجوم تھا لیکن صدر نشین بزم اب حیات جاوید کے بستر پر آرام کر رہا تھا۔'' (ص ۸۱)

یہ اقتباسات نمونہ کے طور پر پیش کیے گئے ہیں، اصل لطف کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہوگا۔

سید صاحب نے امام صاحب اور ان کے علمی و فقہی کارناموں کے تعارف کے لیے یہ اعلیٰ ادبی اسلوب اس لیے اختیار کیا تھا کہ نئی نسل کو اس سے دلچسپی پیدا ہو، اور پتہ چلے کہ یہ کتاب صرف امام مالکؒ کے حالات کی کھتونی نہیں ہے بلکہ اس میں ان کے ذوق وشوق کی تسکین کا سامان بھی موجود ہے۔ سوانح نگاری میں ادب کی لذت شامل کرنے کی ابتدا شبلی نے کی۔ سید صاحب دبستان شبلی کے گل سرسبد ہیں، انہوں نے شبلی کی اس روایت کو اپنی اس کتاب میں پوری طرح فروغ دینے کی کوشش

کی ہے اور اسلوب شبلی کے متبعین کے لیے قابل تقلید نمونہ پیش کیا ہے البتہ سید صاحب نے امام مالک سے حسن عقیدت کی جو خوشبو اس میں بکھیری ہے اس سے یہ تاثر ضرور ابھرتا ہے کہ سید صاحب مالکی ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ مسلکاً حنفی تھے اور پوری زندگی فقہ حنفی کے متبع رہے۔

اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ سید صاحب نے اپنے منصوبہ کے مطابق حیات امام مالکؒ کے بیشتر پہلوؤں کا احاطہ کرلیا تھا۔ صرف اجتہاد کی بحث کی تکمیل باقی تھی جس کا وہ آغاز کر چکے تھے اوران کے بقول یہی حصہ کتاب کا اصلی جوہر تھا۔ سید صاحب کی یہ بحث کس طرز و انداز کی ہوتی اس کے نمونے کتاب میں متعدد جگہوں پر موجود ہیں۔ بعض مقامات بالخصوص جہاں فقہ مالک کی بنیادوں کا تذکرہ کیا ہے وہاں لکھتے ہیں کہ امام مالک کے فقہ کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث، مراسیل ثقاۃ، قضایائے عمر، آثار صحابہ وفتاوائے فقہائے مدینہ پر ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ مؤطا کے طرز استدلال اور احادیث وآثار کا جس نے بغور مطالعہ کیا ہے وہ یقیناً اس کی تایید کرے گا کہ امام مالک کی فقہ وفتاوی کے یہی بنیادی اصول ہیں اور انہی اصولوں پر امام مالک فتاوائے فقہیہ کا جواب دیتے تھے۔ (ص ۵۶، ۵۷)

امام مالک نے خود اصول فقہ میں کوئی تصنیف نہیں فرمائی اور نہ ہی اصولوں کے طریقۂ استخراج کی نشاندہی کی تھی۔ مؤطا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حدیث مرسل، منقطع اور بلاغات کو اخذ کیا تھا لیکن طریقۂ اخذ نہیں بتایا۔ اسی طرح چونکہ انہوں نے حدیثیں صرف ثقہ راویوں سے اخذ کی ہیں اس لیے ان کو اسناد کی جرح وتعدیل کی ضرورت کم ہی پڑی۔ البتہ انتخاب شیوخ میں انہوں نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا یا عام محدثین سے عدم روایت کے جن اسباب کی نشاندہی کی تھی اس کے مطالعہ سے ان کے اصول جرح کا استخراج کیا جا سکتا ہے۔ بعد میں فقہ مالکی کے اصول استنباط سے متعلق جو متعدد کتابیں لکھی گئیں اور جن میں باقاعدہ فقہ مالکی کے اصولوں میں قرآن مجید، سنت، اجماع، اجماع اہل مدینہ، قیاس، قول صحابی، مصلحت مرسلہ، عرف وعادت، سد ذرائع، استصحاب اور استحسان وغیرہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ظاہر ہے ان اصولوں کا استخراج امام مالک کے فتاوی سے کیا گیا ہے۔ سید صاحب یقیناً اجتہادات مالکی کی تحقیق وتمحیص میں ان اصولوں کو ضرور زیر بحث لاتے اور اس سے متعلق حقایق و معلومات کا ایک جہاں آباد کرتے۔

سید صاحب نے ''فقہ مالک'' کی سرخی کے تحت لکھا ہے کہ امام مالک نے فتوی دینے میں بہت

احتیاط برتی اور جب تک ستر علمائے عظام نے ان کی لیاقت فتوی پر مہر نہ لگادی فتوی نہ دیا۔(ص ۵۷)
اس کے باوجود اگر جزئیہ پر اطلاع نہ ہوتی تو بلا جھجھک ''لاادری'' فرما دیتے، نہ جانے کتنوں کو اسی احساس کے سبب جواب نہیں دیا جو دور دراز ملکوں کا سفر کر کے امام صاحب کے پاس جاتے تھے۔ فتوی کے جواب میں اکثر ''قال رسول اللہ کذا'' کہتے۔لوگ ذاتی رائے پوچھتے تو قرآن کی آیت ''فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْيُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ'' پڑھ دیتے۔ جب کسی مسئلہ قیاسی کو بیان کرتے تو یہ آیت پڑھتے۔''اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ'' جو جواب دیتے اس میں حد درجہ دقت نظری اور باریک بینی سے کام لیتے۔مسئلہ میں اگر غلطی کی جانب کوئی توجہ دلاتا تو فوراً تسلیم کر لیتے۔(۶۰،۶۱)

اس قدر محتاط ہونے کے باوجود سید صاحب کا خود بیان ہے کہ امام مالک نے ۶۰ برس متصل فقہ وفتاوی میں صرف کیے۔ان کے بعض تلامذہ اسد بن فرات نے ''اسدیہ''، عبدالرحمٰن بن قاسم نے ''المدونہ'' اور ابن وہب نے ''کتاب المجالسات'' کے نام سے ان کے مسائل وفتاوی کی تدوین کی تھی، ان میں امام کے ہزاروں فتاوی مدون ہیں۔ابن قاسم کی نسبت ہے کہ ان کو امام مالک کے ۴۰ ہزار مسائل زبانی یاد تھے۔(ص ۶۲) اس طرح اجتہادات مالک کی بحث کے لیے سید صاحب کے سامنے خاصا مواد موجود تھا۔کاش سید صاحب کے قلم اعجاز رقم سے یہ کام پورا ہو گیا ہوتا تو علمی دنیا بالخصوص شیدایان مالک کو ''حیات امام مالک'' کی عدم تکمیل کا داغ نہ سہنا پڑتا۔

بہرحال اس کتاب کو منظر عام پر آئے ہوئے ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گذر گیا لیکن اردو میں اب تک سوانح مالک پر اس معیار کی کوئی دوسری کتاب سامنے نہ آسکی اور یہ آج بھی مفید معلومات کا ماخذ بنی ہوئی ہے۔ڈاکٹر حمید اللہ کے بہ قول ''اگر کوئی اس سے بہتر کتاب لکھنے کی کوشش کرے گا تو وہ اسی کے ایجاز کا اطناب ہوگا''۔(۳۴)

حواشی ومراجع

(۱) حیات امام مالک مولانا سید سلیمان ندوی، ص ۱۰، مکتبہ الشرق آرام باغ کراچی، ۱۹۵۱ء۔(۲) مطالعہ سلیمانی و مقالاتِ بزم سلیمانی، مسعود الرحمٰن خان ندوی، محمد حسان خان ندوی، ص ۵۸، ۵۹، جمال پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۸۶ء۔

(۳) دیباچہ حیات امام مالک ص ۱۰۔ (۴) ایضاً ص ۹۔ (۵) علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت اور ادبی خدمات، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ص ۸۸، مطبوعہ شکیل پرنٹنگ پریس کراچی۔ (۶) حیات سلیمان، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۹۱، جدید ایڈیشن ۲۰۱۱ء۔ (۷) تاریخ ارض القرآن، دیباچہ طبع چہارم، معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء۔ (۸) علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت اور ادبی خدمات ص ۸۹۔ (۹) پیش لفظ حیات امام مالک ص ۸۔ (۱۰) معارف دسمبر ۱۹۸۵ء ص ۴۲۳۔ (۱۱) دیباچہ حیات امام مالک ص ۹۔ (۱۲) ایضاً ص ۸ مطبوعہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء طبع دوم۔ (۱۳) سیر اعلام النبلاء، علامہ شمس الدین ذہبی، جلد ۸، ص ۱۴۲ الموسوعۃ الشاملہ۔ (۱۴) ترتیب المدارك وتقریب المسالك باب فی ترجیحه من طریق النقل، جلد ۱، ص ۱۷۷، الموسوعۃ الشاملہ۔ (۱۵) غرائب حدیث مالک، حافظ ابوالحسین محمد بن المظفر البزاز (متوفی ۳۷۹ھ) ص ۲۴۰، دار السلف للنشر و التوزیع، المملکة العربیه السعودیه، الریاض و کتاب الجرح و التعدیل، باب ما ذکر من صحة حدیث مالك، و علمه بالآثار، ابن ابی حاتم، جلد ۱ ص ۱۳، الموسوعة الشامله۔ (۱۶) جلد ۷، ص ۱۵۴، تقدیم وتحشیہ محمد ایمن الشبراوی، دارالحدیث القاہرہ ۲۰۰۶ء۔ (۱۷) جلد ۲، ص ۲۰۱ (۱۸) مصفی، شاہ ولی اللہ دہلوی، ص ۵، جید برقی پریس بلی ماران دہلی۔ (۱۹) حیات امام مالک ص ۱۴۔ (۲۰) سورہ احقاف ۴۶: ۱۵۔ (۲۱) حیات امام مالک، ص ۳۴، ۳۵، (۲۲) ایضاً، ص ۳۶۔ (۲۳) ایضاً، ص ۳۷۔ (۲۴) ایضاً، ص ۵۷۔ (۲۵) وفیات الاعیان، ابن خلکان، ج ۲ ص ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ (۲۶) سیر اعلام النبلاء، جلد ۷، ص ۱۶۰ (۲۷) حیات امام مالک، ص ۸۰۔ (۲۸) ایضاً۔ (۲۹) ائمہ اربعہ، قاضی اطہر مبارکپوری، ص ۱۳۹، ۱۴۰، نازیہ پرنٹنگ پریس دہلی۔ (۳۰) کتب احادیث میں اس حدیث کا متن اس طرح ہے۔ ''ثلث جدهن جد وهزلهن جد، النكاح و الطلاق و الرجعة''، دیکھیے ترمذی ابواب الطلاق و اللعان، باب ما جاء فی الجد و الهزل فی الطلاق، ص ۲۲۵، مطبوعہ دیوبند و سنن ابی داؤد کتاب الطلاق باب فی الطلاق علی الهزل، ص ۲۹۸، دارالاشاعت اسلامیہ کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ۔ (۳۱) حیات امام مالک، ص ۵۸۔ (۳۲) تقدمۃ الجرح والتعدیل، ابومحمد عبدالرحمٰن بن ابی حاتم رازی، ص ۱۲، حیدرآباد بحوالہ ائمہ اربعہ، ص ۱۳۹۔ (۳۳) ائمہ اربعہ، حیات اور علمی و فقہی خدمات، مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، ص ۳۸۴، کمال بکڈپو نزد مدرسہ شمس العلوم (شمسی گلی) گھوسی مئو۔ (۳۴) معارف دسمبر ۱۹۸۵ء، ص ۴۳۶۔

قرآن کریم سے احکام کے استنباط میں حنفی وشافعی مناہج

ڈاکٹر محمد سراج الدین

اہل سنت کے فقہی مسالک میں حنفی وشافعی دونوں اہم ہیں، جن میں احکام کے استنباط میں قرآن کریم کو اساسی حیثیت دی گئی ہے، البتہ قرآن کریم سے مسائل کے استنباط میں دونوں مسلکوں کے فقہاء کے مناہج الگ الگ ہیں، زیر نظر مقالہ میں ان ہی مناہج استنباط کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ تاکہ نئے مسائل میں ان سے استفادہ کرکے ان کے حل کی تلاش کے لیے راہیں ہموار ہوسکیں۔

احکام کے استنباط میں فقہاء احناف کے مناہج: ۱۔ آیت کے ظاہری مفہوم سے مسائل کا استنباط:

فقہاء حنفیہ آیت کے ظاہری مفہوم سے مسائل مستنبط کرتے ہیں، مثلاً اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلاَ تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَّنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ (۱)

اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو انہیں ان کے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو۔

امام ابوبکر جصاص رازی اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط کرتے ہیں کہ عورت اپنا نکاح ولی کے بغیر بھی کرسکتی ہے۔

طریقۂ استنباط اس طرح ہے:

اس آیت میں نکاح کی نسبت عورتوں کی طرف کی گئی ہے "أن ینکحن" (عورتیں اپنا نکاح کرلیں) اور اس میں ولی کی اجازت کی کوئی شرط نہیں لگائی گئی ہے۔ نیز عورت سابق شوہر سے نکاح

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، سری نگر۔

کرنے پر راضی ہوتو اس کے سرپرستوں کو نکاح میں خلل ڈالنے سے منع کیا ہے۔(۲) لہٰذا اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ عورت ولی کے بغیر اپنا نکاح کرسکتی ہے۔

۲۔صحابۂ کرام کے آثار کی روشنی میں قرآن کریم سے احکام کا استنباط: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنۡ قَتَلَ مُؤۡمِناً خَطَأً فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهۡلِهِۦٓ إِلَّآ أَن يَصَّدَّقُواْ فَإِن كَانَ مِن قَوۡمٍ عَدُوٍّ لَّكُمۡ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ وَإِن كَانَ مِن قَوۡمٍ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُم مِّيثَٰقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهۡلِهِۦ (۳)

جو شخص کسی مسلمان کو بلاقصد غلطی سے قتل کردے، تو اس کے ذمہ ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہے اور مقتول کے عزیزوں کو دیت یعنی خون بہا ادا کرنا ہے، الاّ یہ کہ وہ بطور صدقہ معاف کردیں اور اگر مقتول تمہاری دشمن قوم کا ہو، لیکن وہ (مقتول) مسلمان ہو، تو صرف ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے اور اگر مقتول اس قوم کا ہو جس سے تم میں اور ان میں عہد و پیمان ہو تو خون بہا ادا کرنا ہے۔

امام ابوبکر جصاص رازی فرماتے ہیں: اس آیت سے یہ حکم مستنبط ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کی دیت اور غیر مسلم، یہودی، نصرانی، مجوسی اور معاہد (جس کافر قوم سے معاہدہ ہو)، اور ذمی (مسلم ریاست کا غیر مسلم باشندہ) کی دیت کی مقدار برابر ہے۔ کیونکہ دیت (خون بہا) مال کے ایک متعین مقدار کو کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں مومن مقتول کی دیت ادا کرنے کا حکم دیا ہے، پھر اسی پر عطف کرتے ہوئے غیر مسلم مقتول کی دیت ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور دونوں کی دیتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں بیان فرمایا ہے، چونکہ دیت کی مقدار اس وقت لوگوں کے درمیان متعارف تھی، لہٰذا دونوں کی ایک ہی دیت واجب ہوگی، کوئی فرق نہیں ہوگا۔

قرآن کریم سے اس حکم کے مستنبط کرنے میں صحابۂ کرام کے اقوال سے مدد لی گئی ہے۔

امام ابوبکر جصاص رازی تحریر فرماتے ہیں: فهذه الأخبار وما ذكرناه من أقاويل السلف مع موافقتها لظاهر الآية توجب مساواة الكافر للمسلم في الديات۔(۴) (یہ روایتیں اور جو سلف (ابوبکر، عمر و عثمان رضی اللہ عنہم) کے آثار ہم نے ذکر کیے ہیں، آیت کے ظاہری مفہوم کے موافق ہیں، جو مسلم اور کافر کی دیتوں کے درمیان مساوات کو واجب کرتی ہے۔)

۳۔عام اصول سے احکام کا استنباط: مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (۵)	اے ایمان والو! اپنے آپس کے مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ، سوائے اس کے کہ تمہاری آپس کی رضامندی سے خرید وفروخت ہو۔

امام ابوبکر جصاص رازی نے اس آیت سے یہ حکم مستنبط کیا ہے کہ بیع میں خیار مجلس (یعنی بیع میں ایجاب وقبول کے بعد جب تک مجلس باقی رہے، ہر دو فریق کو اختیار رہے کہ وہ اس معاملہ کو ختم کردے) درست نہیں ہے، کیونکہ یہ خرید وفروخت کے عام اصول کے خلاف ہے۔ابوبکر جصاص رازی لکھتے ہیں: ''فإنه ليست فی الأصول فرقة يتعلق بها تمليك و تصحيح العقد بل فی الأصول أن الفرقة إنما تؤثر فی فسخ كثير من العقود من ذلك''۔(۶)

یعنی عام اصول یہ ہے کہ فرقت اور جدائی سے عقد بیع کی صحت اور تملیک متعلق نہیں ہوتی ہے بلکہ اصول یہ ہے کہ فرقت اور جدائیگی سے بہت سارا عقد فسخ ہوجاتا ہے، جیسے عقد صرف میں قبضہ سے پہلے جدائیگی ہوجائے۔

۴۔قیاس سے احکام کا استنباط: قیاس کا مفہوم۔قیاس کے لغوی معنی اندازہ کرنے کے بھی ہیں اور دو چیزوں کو ایک دوسرے کے برابر کرنے کے بھی، فقہاء کی اصطلاح میں علت کے مشترک ہونے کی بنا پر غیر منصوص واقعہ میں منصوص واقعہ یعنی اصل کا حکم لگانے کو قیاس کہتے ہیں۔(۷)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُؤُسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ (۸)	اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولو، اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھولو۔

امام ابوبکر جصاص رازی نے اس آیت سے قیاس کی بنیاد پر یہ حکم مستنبط کیا ہے کہ وضو کے لیے نیت شرط نہیں ہے، ابوبکر جصاص رازی فرماتے ہیں:

ومن وجهة النظر أن الوضوء طهارة بالماء كغسل النجاسة وأيضا هو لسبب يتوصل	یعنی وضو نام ہے ہاتھ، پاؤں اور چہرہ دھوکر ان اعضاء سے حدث (نجاست حکمی) کو ختم کرنے کا،

به إلى صحة أداء الصلاة لا على وجه البدل عن غيره فأشبه غسل النجاسة وستر العورة والوقوف على مكان طاهر ۔(۹)

لٰہذا جس طرح ناپاک کپڑے کو دھونے کے لیے نیت ضروری نہیں ہے، وضو کے لیے بھی نیت ضروری نہیں ہوگی۔

۵۔عرف سے احکام کا استنباط: عرف کا مفہوم کسی فعل یا قول سے متعلق عام لوگوں کے طریقہ کو عرف کہتے ہیں، عرف پر عمل کرنے کے لیے فقہاء اصولیین نے چند شرائط ذکر کی ہیں، جو اصول فقہ کی کتابوں میں موجود ہے، وہ یہ ہیں: ۱۔عرف پر عمل کرنے کی وجہ سے کسی نص کی مخالفت لازم نہ آتی ہو، ۲۔عرف متکلم کی صراحت کے خلاف نہ ہو، ۳۔عرف معاملہ کے وقت موجود ہو، ۴۔عرف جاری ہو۔(۱۰)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ (۱۱)

اے ایمان والو! آپس کے مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ، الاّ یہ کہ آپس کی رضامندی سے خرید و فروخت ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خرید وفروخت میں عاقدین (خریدنے والا اور بیچنے والا) جس قیمت پر متفق ہوجائیں، درست ہے، اسی کو ''عقد مساومہ'' کہتے ہیں۔(۱۲)

لٰہذا عرف کی وجہ سے عقد مساومہ جائز ہوگا۔

امام ابوبکر جصاص رازی فرماتے ہیں: ''وقد قال أصحابنا فيما جرت به العادة بأنهم يريدون به إيجاب التمليك وإيقاع العقد أنه يقع به العقد: وهو أن يساومه على شئ ثم يزن له الدراهم ويأخذ المبيع فجعلوا ذلك عقدا''۔(۱۳)

۶۔استحسان سے احکام کا استنباط: استحسان کا مفہوم، استحسان ''حسن'' سے ماخوذ ہے، جو باب ''استفعل'' سے ہے، لغوی لحاظ سے اس کے دو معنی ہیں: اول: کسی شئ کو بہتر خیال کرنا، دوسرا معنی طلب احسن یعنی اچھی بات کے طلب گار ہونے کے ہیں اور فقہاء کی اصطلاح میں کسی قوی تر دلیل کی بنیاد پر قیاس کو چھوڑ دینے کو استحسان کہتے ہیں، وہ قوی تر دلیل نص بھی ہوسکتی ہے، اجماع اور تعامل بھی ہوسکتا ہے اور ضرورت و مصلحت بھی ہوسکتی ہے۔(۱۴)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ (۱۵)
تم پر مرداراور خون اور خنزیر کا گوشت حرام کیا ہے۔

اس آیت سے فقہانے یہ حکم مستنبط کیا ہے کہ خنزیر کے تمام اجزاء سے استفادہ حرام ہے، البتہ سلائی کے لیے خنزیر کے بال کے استعمال کی اجازت ہے، اس طرح خنزیر کے بال کی خرید و فروخت بھی جائز ہے۔

امام ابوبکر جصاص رازی فرماتے ہیں:

إلا أن من أباح الانتفاع به من أصحابنا فذکر أنه إنما أجازه استحسانا (۱۶)
ہمارے اصحاب حنفیہ میں سے جن لوگوں نے خنزیر کے بال سے انتفاع کو جائز قرار دیا ہے، وہ استحسان کی وجہ سے ہے۔

۷۔شرع من قبلنا (سابقہ شریعت) سے احکام کا استنباط: شرع من قبلنا سے مراد یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی امتوں کو جو احکام دیے گئے تھے اگرچہ ان احکام کا قرآن میں تذکرہ ہے لیکن یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ احکام اس امت کے لیے بھی ہیں یا نہیں یا صرف تذکرہ سے وہ احکام اس امت پر لازم ہوں گے یا نہیں؟ حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ احکام اس امت پر بھی لازم ہوں گے۔(۱۷) مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ (۱۸)
اور ہم نے ان کے ذمہ یہ بات مقرر کر دی تھی کہ جان کے بدلے جان۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ سابقہ امت پر یہ فرض کیا گیا تھا کہ جان کے بدلے جان کو قتل کیا جائے گا، خواہ مقتول کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، قاتل کو بہر حال قتل کیا جائے گا، ابوبکر جصاص رازی اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسلام میں بھی مقتول مسلم ہو یا کافر قاتل سے بہر حال قصاص لیا جائے گا۔

ابوبکر جصاص رازی فرماتے ہیں: قولہ تعالیٰ: ''وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ''، يقتضي عمومه قتل المؤمن بالكافر، لأن شريعة من قبلنا من الأنبياء ثابتة في حقنا ما لم ينسخها الله تعالىٰ على لسان رسوله صلى الله عليه وسلم، وتصير حينئذ شريعة النبي صلى

اللہ علیہ وسلم۔(۱۹) (اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ ''ہم نے ان لوگوں پر فرض قرار دیا تھا کہ جان کو جان کے بدلہ قتل کیا جائے گا، اس جملے کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کو کافر کے بدلہ قتل کیا جائے گا، اس لیے کہ ہم سے پہلے آنے والے انبیاء کی شریعت ہمارے لیے حجت ہے، جب تک کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اس کو منسوخ نہ کردیں، لہٰذا وہ ہمارے لیے بھی شریعت ہے۔)

۸۔عام اصول وقواعد سے حکم کا استنباط: حنفی فقہاء نے بہت سے احکام کا استنباط اصول فقہ کے عام اصول وقواعد سے کیا ہے، مثلاً اصول فقہ کا قاعدہ ہے: ا۔ان الزیادۃ فی النص غیر جائزۃ إلا بمثل ما یجوز بہ النسخ (نص میں زیادتی جائز نہیں ہے، الاّ یہ کہ اس کے مساوی کوئی نص ہو جس سے نسخ کرنا جائز ہو)۔

چنانچہ اللہ تعالی نے زنا کی سزا سو کوڑے مقرر کی ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ	زنا کرنے والے مرد اور زنا کرنے والی عورت میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

اس آیت کے تحت جصاص رازی تحریر کرتے ہیں: زنا کی حد قرآن میں صرف جلد (سو کوڑے) مذکور ہے، لہٰذا مجرم کو صرف سو کوڑے مارے جائیں گے، اس کو جلاوطن نہیں کیا جائے گا، کیونکہ جلاوطنی کا ثبوت خبر واحد سے ہے اور خبر واحد سے نص پر زیادتی درست نہیں ہے۔(۲۰)

اصول فقہ کا دوسرا قاعدہ ہے:

الحکم لعموم اللفظ الا أن تقوم الدلالۃ علی الاقتصار بہ علی السبب	حکم لفظ کے عموم کی بنیاد پر ہوتا ہے، الاّ یہ کہ کوئی قرینہ ہو جو سبب پر انحصار کا متقاضی ہو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا جَزَآءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا (۲۱)	ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں، اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔الخ

یہ آیت قبیلہ عرینہ کے تعلق سے ہے، جب وہ چراگاہ سے چرواہوں کو بے دردی سے قتل

کر کے تمام جانوروں کو لے کر بھاگ گئے لیکن یہ حکم عام ہوگا اور ڈاکہ زنی کرنے والے ہر شخص کی سزا یہی ہوگی۔(۲۲)

فقہ شافعی اور قرآن کریم سے استنباط احکام کے مناہج: فقہ شافعی کو یہ شرف حاصل ہے کہ صاحب مسلک نے اپنے مسلک کے اصول وقواعد خود وضع کیے اور ان کے ذریعہ مستنبط ہونے والے مسائل واحکام کا ایک بیش بہا ذخیرہ چھوڑا، امام شافعی نے ''الرسالہ'' نامی کتاب تحریر فرمائی، جس میں انہوں نے مسائل کے استنباط کے لیے جن مصادر کا استعمال کیا ہے، ان کا ذکر فرمایا، نیز ان مصادر سے مسائل کے اخذ واستنباط کے طریقے لکھے اور اصول وقواعد تحریر فرمائے اور پھر ''احکام القرآن'' نامی کتاب لکھی جس میں قرآن سے ہزاروں مسائل مستنبط کیے اور پھر ''الام'' اور اس طرح کی کئی کتابیں لکھیں جن میں انہوں نے ان مسائل کو جمع کیا جن کو مصادر شریعہ سے مستنبط فرمایا تھا۔

قرآن کریم سے استنباطِ احکام کے مناہج: امام شافعی علیہ الرحمہ نے قرآن کریم سے مسائل واحکام کے استنباط میں جن قواعد واصول کو اختیار کیا ہے، وہ درج ذیل ہے:

۱۔آیت کے شان نزول سے احکام کا استنباط: قرآن کریم کی آیت کا صحیح مفہوم اور معنی سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ جس پس منظر میں آیت نازل ہوئی ہے، اس پس منظر کو سمجھا جائے، تاکہ پس منظر کی مدد سے الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھا جا سکے۔امام شافعی نے اس اصول سے بہت سے مسائل مستنبط کیے ہیں۔مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ'' (۲۳) اس آیت کے تحت امام شافعی فرماتے ہیں: ''نزلت هذه الآية فيما بلغنا - والله أعلم - في رجل خاصم الزبير في أرض فقضى النبي صلى الله عليه وسلم بها للزبير الخ'' (۲۴)، (ہمیں یہ بات پہنچی ہے (واللہ اعلم) کہ یہ آیت ایک ایسے شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس نے ایک زمین کے سلسلہ میں حضرت زبیرؓ سے مخاصمت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیرؓ کے حق میں فیصلہ فرمایا، تو وہ اس فیصلہ پر چیں بجبیں ہوا۔)

اسی طرح تیمم کے سلسلہ میں فرماتے ہیں: ''نزلت آية التيمم في غزوة بني المصطلق'' (۲۵) (آیت تیمم غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر نازل ہوئی)۔

امام شافعی بسا اوقات سبب نزول ہی کی بنیاد پر کسی آیت کے عموم کو خاص کرتے ہیں، مثلاً

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ''(۲۶)

امام شافعی فرماتے ہیں: ''نزل یوم الحدیبیۃ وأحصر النبی بعدو، فمن حال بینہ وبین مرض حابس فلیس بداخل فی معنی ھذہ الآیۃ، لأن الآیۃ نزلت فی الحائل من العدو''(۲۷) (یہ آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی جبکہ دشمنوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو روک دیا تھا، لہٰذا اگر کسی شخص کو بیت اللہ جانے سے مرض روک دے تو وہ اس آیت کا مصداق نہیں ہے، اس لیے کہ آیت دشمن کے ذریعہ روکے جانے کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے)۔

حدیبیہ کے مقام پر دشمنوں نے عمرہ کرنے سے روک دیا، تو آپؐ نے اسی مقام پر قربانی کر لی اور احرام کھول کر حلال ہو گئے، یہی حکم ہر اس شخص کے لیے ہے جو عمرہ یا حج کے ارادہ سے احرام باندھ کر نکلے لیکن دشمن اسے روک دے اور حج نہ کرنے دے تو وہ جانور قربان کر کے احرام کھول لے اور حلال ہو جائے، یہ مسئلہ حنفیہ وشافعیہ کے درمیان متفق علیہ ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص عمرہ یا حج کے ارادہ سے نکلا، لیکن وہ بیمار ہو گیا یا کوئی اور عذر پیش آ گیا تو کیا اس کا بھی یہی حکم ہوگا، حنفیہ وشافعیہ کے نقاط نظر اس مسئلہ میں الگ الگ ہیں۔ شافعیہ سبب نزول کی بنیاد پر اس حکم کو دشمنوں کے ذریعہ روکے جانے کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور دوسروں کو اس حکم کا مصداق نہیں سمجھتے ہیں۔

اگر کوئی آیت کسی خاص سبب یا کسی خاص واقعہ کے تحت نازل ہوئی تو امام شافعی اس حکم کو اسی جیسے واقعہ کے ساتھ خاص کرتے ہیں، دوسرے واقعہ کے ساتھ اس حکم کو نہیں لگاتے ہیں۔ جبکہ دیگر ائمہ کا مسلک اس کے برخلاف ہے، دیگر ائمہ کا قول ہے: ''العبرۃ بعموم اللفظ لا بخصوص السبب'' (۲۸) (لفظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے، کسی خاص سبب کا نہیں)۔

۲۔ الفاظ کے ظاہری معنی سے احکام کا استنباط: امام شافعی الفاظ کے ظاہری معنی ومفہوم پر زور دیتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی تاویل پسند نہیں فرماتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ''(۲۹)، (یا تم نے عورتوں سے لمس کیا ہے)، یعنی اگر عورتوں سے لمس کیا ہے تو وضو ٹوٹ گیا، ''لمس'' کا مفہوم کیا ہے، امام شافعی فرماتے ہیں لمس کے ظاہری معنی ہاتھ سے چھونے کے ہیں، لہٰذا عورتوں کو ہاتھ سے چھونے سے وضو ٹوٹ جائے گا۔ (۳۰)، جبکہ حنفیہ کے یہاں لمس سے صحبت مراد ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ'' (۳۱) یعنی حج میں اگر محرم شخص کسی جانور کا شکار کرلے، تو اس پر فدیہ واجب ہوگا، فدیہ میں کیا چیز واجب ہوگی، قرآن نے اس کے لیے ''جزاء'' کا لفظ استعمال کیا ہے، جزاء کا ظاہری مفہوم ہے جسم وجثہ وغیرہ کے لحاظ سے اسی کے مانند جانور، لیکن معنوی مفہوم یہ ہے کہ اسی قدر و قیمت کا جانور۔ امام شافعی نے ظاہری معنی اختیار کرتے ہوئے جسم وجثہ کے لحاظ سے اسی کے مانند جانور مراد لیا ہے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں: ''واحتج فی إیجاب المثل فی جزاء دواب الصید دون اعتبار القیمۃ بظاھر الآیۃ'' (۳۲) (شکاری جانور کی جزا میں قیمت کے بجائے مثل واجب کرنے میں امام شافعی نے آیت کے ظاہری مفہوم سے استدلال کیا ہے۔)

۳۔ احکام کے استنباط کرنے میں لفظ کے عموم اور اطلاق کی رعایت: قرآن کریم میں مختلف احکام کے ساتھ عام لفظ یا مطلق لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ دونوں چونکہ کثیر افراد پر دلالت کرتے ہیں، لہٰذا احکام کے استنباط میں امام شافعی نے اس کو خصوصی طور سے ملحوظ رکھا ہے۔ امام شافعی نے احکام کے استنباط میں اس قاعدہ کا بہت استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً'' (اور تم پانی نہ پاؤ) امام شافعی فرماتے ہیں: ''وذکر الماء عاما فکان ماء السماء، وماء الأنہار، والآبار والفلات والبحار العذب من جمیعہ والأجاج سواء معنی أنہ یطھر من وتوضأ واغتسل بہ'' (۳۳)، (اللہ تعالیٰ نے ''ماء'' (پانی) کا لفظ ارشاد فرمایا ہے جو عام ہے، لہٰذا بارش کا پانی، دریا کا پانی، کنویں کا پانی، غار کا پانی، میٹھا پانی اور نمکین پانی سب برابر ہیں، جس سے بھی وضو یا غسل کیا جائے، طہارت حاصل ہوجائے گی۔)

اسی طرح اگر کسی حکم کو مطلق ذکر کیا جائے تو اس کا اطلاق اس کے سب سے کم عدد پر ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قسم کے کفارہ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: أو کسوۃ'' (یا کپڑا ہو) کسوۃ مطلق ہے، اس لیے کپڑا کا اتنا حصہ کافی ہوگا، جس پر کسوۃ کا اطلاق ہوسکے، مثلاً ایک عمامہ، پاجامہ، تہبند، مرد کا ہو، یا عورت کا ہو یا بچہ کا، کچھ بھی ادا کردیا جائے تو کافی ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں: ''لأن اللہ عزوجل أطلقہ فھو مطلق'' (۳۴)، (اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مطلق ذکر کیا ہے، اس لیے مطلق ہی رہے گا)۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَلَا جُنُباً إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا (۳۵)　　جنابت کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ غسل نہ کرلو۔

امام شافعی اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:

وکان فرض اللہ الغسل مطلقا لم یذکر فیہ شیئا یبدأ بہ قبل شئ فإذا جاء المغتسل بالغسل أجزأہ۔ واللہ أعلم۔ کیف ما جاء بہ (۳۶)　　اللہ تعالیٰ نے مطلقاً غسل فرض قرار دیا ہے، کچھ بھی وضاحت نہیں کی ہے کہ غسل سے پہلے کس چیز سے شروع کیا جائے، لہٰذا غسل کرنے والا جس طرح بھی غسل کرلے گا کافی ہوگا۔

اگر کسی جگہ حکم مطلق ذکر کیا جائے اور دوسری جگہ اسی حکم کے ساتھ کوئی قید ذکر کردی جائے تو امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ہر جگہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا، مثلاً اللہ تعالیٰ نے کفارۂ ظہار (یعنی کوئی شخص اپنی بیوی کو ماں سے تشبیہ دیدے تو اس صورت میں اس کی بیوی اس پر حرام ہوجاتی ہے، جب تک کہ اس کا کفارہ ادا نہ کردے) میں مطلقاً ارشاد فرمایا: ''فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ'' (۳۷)، (ایک رقبہ (غلام) آزاد کرنا ہے)، یہاں اللہ تعالیٰ نے مطلقاً رقبہ آزاد کرنے کا حکم دیا ہے، خواہ مومن ہو یا کافر، لیکن اللہ تعالیٰ نے قتل خطاء کے کفارہ میں ارشاد فرمایا: ''فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ'' (۳۸)، (ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے)۔ اس آیت میں مومن غلام کی قید ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ''لا یجزیہ تحریر رقبة علی غیر دین الإسلام، لأن اللہ یقول فی القتل ''فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ'' (۳۹)، (مسلم غلام کے علاوہ آزاد کرنا کافی نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قتل کے بارے میں ارشاد فرمایا: ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے)۔

۴۔ احکام کے استنباط کے لیے ناسخ ومنسوخ کی معرفت: قرآن کریم سے احکام کو مستنبط کرنے کے لیے اس بات کا علم ضروری ہے کہ کونسی آیتیں منسوخ ہیں اور کونسی ناسخ، امام شافعیؒ نے ناسخ منسوخ کے علم کو ہر عالم کے لیے ضروری اور اس علم کو تمام علوم کے لیے مقدمہ قرار دیا ہے۔ امام شافعیؒ نے اپنی کتاب ''الرسالہ'' اور احکام القرآن میں ناسخ اور منسوخ پر بہت ہی تفصیل سے بحث کی ہے۔ (۴۰)

۵۔ حدیث کے ذریعہ قرآن کریم سے احکام کا استنباط: امام شافعیؒ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ سنت کی حیثیت قرآن کریم کے شارح کی ہے، قرآن کریم کی کسی آیت میں اجمال اور ابہام ہوتا

ہے،تو سنت اس کی تفصیل اور تشریح بیان کرتی ہے،قرآن کا کوئی لفظ عمومی معنی پر دلالت کرتا ہے،تو سنت وضاحت کرتی ہے کہ یہاں عموم مراد نہیں ہے، بلکہ مخصوص افراد مراد ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ’’وَلِاَبَوَیۡهِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ‘‘ (۴۱)،(والدین میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے) اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ والدین کو اولاد کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ میراث ملے گا،خواہ والدین مسلمان ہوں یا نہ ہوں لیکن سنت نے وضاحت کی کہ اس آیت میں مطلق والدین مراد نہیں ہیں، بلکہ وہ والدین مراد ہیں جو مسلمان ہوں،اس طرح سنت نے قرآن کریم کے ایک عام حکم کو خاص کر دیا۔امام شافعیؒ فرماتے ہیں:’’فدلت سنة رسول الله على أنه إنما أريد به بعض الوالدين والأزواج دون بعض،وذلك أن يكون دين الوالدين والمولود واحدا‘‘ ۔(۴۲)

اسی طرح نماز،روزہ،زکوٰۃ اور حج کی ادائیگی کا قرآن نے اجمالاً حکم دیا ہے،سنت نے تشریح کی کہ نماز کے اوقات کیا ہیں، کتنے وقت کی نمازیں فرض ہیں اور کتنی رکعات فرض ہیں وغیرہ،نماز کی مکمل تفصیلات سنت نے بیان کی،اسی طرح بقیہ دیگر عبادات کی تشریح سنت ہی کے ذریعہ معلوم ہوئی۔

۶۔عقلی دلائل سے احکام کا استنباط: امام شافعیؒ نے مختلف مسائل میں عقل کی بنیاد پر احکام کی حد بندی کی ہے۔

۱۔چنانچہ وضو میں سر کا مسح فرض ہے،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:’’وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِکُمۡ‘‘ (۴۳) (اپنے سروں کا مسح کرو)لیکن کتنے سر کا مسح کیا جائے قرآن اس سے خاموش ہے۔امام شافعی نے عقلی بنیاد پر فرمایا کہ سر کے جتنے حصے پر بھی مسح کر لیا جائے کافی ہے، فرماتے ہیں:’’وكان معقولا في الآية أن من مسح من رأسه شيئا فقد مسح برأسه ولم تحتمل الآية إلا هذا-وهو أظهر معانيها أو مسح الرأس كله قال:فدلت السنة على أن ليس على المرء مسح رأسه كله‘‘ (۴۴) (آیت سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگر کسی نے اپنے سر کے کچھ حصہ پر بھی مسح کر لیا تو اس نے اپنے سر کا مسح کر لیا اور آیت اسی کا احتمال رکھتی ہے اور اس کے معانی میں سے یہی زیادہ ظاہر ہے، یا پورے سر کا مسح مراد ہو،لیکن سنت سے یہ ثابت ہے کہ پورا سر مراد نہیں ہے)۔

۲۔ امام شافعیؒ نے عقلی بنیاد پر ہی منی کو پاک قرار دیا ہے۔امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

المني ليس بنجس،لأن الله أكرم من یعنی منی ناپاک نہیں ہے کیونکہ اللہ اس سے پاک ہے

أن یبتدء خلق من کرمھم وجعل منھم النبیین الخ (۴۵)　　　کہ وہ ناپاک چیز سے اشرف مخلوق انسان کو پیدا کرے، انسانوں میں نبی اور رسول بھی ہیں اور اہل جنت دیگر انسان بھی ہیں۔

۷۔قرآن کریم میں کوئی لفظ متعدد مقامات پر مذکور ہوتو ہر جگہ ایک ہی مفہوم مراد ہوگا: ایسے الفاظ جو قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مذکور ہیں، امام شافعیؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہر جگہ ان کا معنی ومفہوم ایک ہی ہوگا، الاّیہ کہ کوئی قرینہ ہو جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہاں کوئی دوسرا مفہوم مراد ہے۔مثلاً قرآن کریم میں ''لاجناح'' اور ''فلیس علیکم جناح'' کے الفاظ متعدد جگہوں پر مذکور ہے، مثلاً ''لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ أَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلاً مِّن رَّبِّکُمۡ'' (۴۶)، (اگر حج کے ساتھ ساتھ) اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں)، ''لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَأۡکُلُوا جَمِیۡعًا اَوۡ اَشۡتَاتًا'' (۴۷) (اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ تم لوگ مل کر کھاؤ یا الگ الگ)۔ ''فَلَیۡسَ عَلَیۡھِنَّ جُنَاحٌ اَنۡ یَّضَعۡنَ ثِیَابَھُنَّ غَیۡرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِیۡنَۃٍ'' (۴۸)، (وہ اگر اپنی چادریں اتار کر رکھ دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہو)۔ ان تمام مقامات پر ''جناح'' کی نفی کا مفہوم اباحت ہے، یعنی یہ کام کیے جاسکتے ہیں، لیکن کرنا واجب اور ضروری نہیں ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں ہے: ''فَلَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَقۡصُرُوۡا مِنَ الصَّلَاۃِ'' (۴۹)، (کوئی مضایقہ نہیں اگر نماز میں قصر کرو۔)

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں بھی ''لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ'' کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سفر میں نماز قصر کرنے کی رخصت دی ہے کہ قصر کیا بھی جاسکتا ہے اور نہیں بھی۔ قصر کرنا ضروری نہیں ہے، جس طرح اوپر کی آیتوں میں ''لاجناح'' کا مفہوم عدم حرج ہے، اسی طرح یہاں بھی ہوگا۔ (۵۰) جبکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مسافر کے لیے نماز میں قصر کرنا ضروری ہے۔

خلاصہ یہ کہ حنفی وشافعی دونوں مسالک فقہ میں قرآن کریم سے احکام ومسائل مستنبط کرنے کے لیے مخصوص مناہج استنباط اختیار کیے گئے ہیں، اسی خصوصیت کی وجہ سے احکام کی تعیین اور درجہ بندی میں مسائل میں تنوع اور اختلاف رونما ہوئے۔ آج ضرورت ہے کہ بین المسالک انٹرافیتھ ڈائیلاگ اور گفتگو ہو اور تمام فقہی مسلکوں کے مناہج استنباط واستنتاج پر تحقیقی مقالے لکھے جائیں تاکہ ان تمام

مسلکوں کا طریقہ اور انداز فکر سامنے آئے اور باہمی اخذ و استفادہ کے ذریعہ تغیر پذیر و ارتقا پذیر معاشرے کے مسائل اور جدید صنعتی و ٹیکنالوجی کے نو پیدا مسائل کے حل کی کوششیں مشترکہ طور پر تیز ہوں اور اسلام کی آفاقی راہنمائی متفقہ طور پر لوگوں کے سامنے آسکے۔اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ، اور یورپی افتا کونسل وغیرہ اسی کے بنیادی و اساسی مظاہر ہیں۔اب اس کے سلسلہ کو مزید بڑھانے اور نوجوان اسکالرس کو اس کڑی سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) قرآن، بقرہ: ۲۳۲۔(۲) رازی، الجصاص، احمد بن علی ابوبکر، احکام القرآن (تحقیق: محمد صادق القمحاوی) دار احیاء التراث العربی بیروت، ج:۲،ص:۹۹۔(۳) قرآن، نساء: ۹۲۔(۴) رازی، الجصاص، احمد بن علی ابوبکر، احکام القرآن (تحقیق: محمد صادق القمحاوی) دار احیاء التراث العربی بیروت، ج: ۳،ص: ۲۱۳۔(۵) قرآن، نساء: ۲۹۔ (۶) رازی، الجصاص، احمد بن علی ابوبکر، احکام القرآن، (تحقیق: محمد صادق القمحاوی) دار احیاء التراث العربی بیروت، ج: ۳،ص: ۱۳۶۔(۷) الخلاف عبدالوہاب، علم اصول الفقہ، مؤسسۃ الصحافۃ والنشر، ندوۃ العلماء لکھنو ۲۰۰۵ء،ص: ۵۲۔(۸) قرآن، مائدہ: ۶۔(۹) رازی، الجصاص، احمد بن علی ابوبکر، احکام القرآن، (تحقیق: محمد صادق القمحاوی) دار احیاء التراث العربی بیروت، ج: ۳،ص: ۳۳۹۔(۱۰) خالد سیف اللہ رحمانی، قاموس الفقہ (مادہ: عرف) زمزم پبلشرز، کراچی ۲۰۰۷ء، ج: ۵،ص: ۳۸۵۔(۱۱) قرآن، نساء: ۲۹۔(۱۲) خالد سیف اللہ رحمانی، قاموس الفقہ (مادہ: مساومہ) زمزم پبلشرز، کراچی ۲۰۰۷ء، ج: ۵،ص: ۸۹۔(۱۳) رازی، الجصاص، احمد بن علی ابوبکر، احکام القرآن (تحقیق: محمد صادق القمحاوی) دار احیاء التراث العربی بیروت، ج: ۱،ص: ۱۵۳۔(۱۴) خالد سیف اللہ رحمانی، قاموس الفقہ (مادہ: استحسان) زمزم پبلشرز، کراچی ۲۰۰۷ء، ج: ۲،ص: ۹۶۔(۱۵) قرآن، بقرہ: ۱۷۳۔(۱۶) رازی، الجصاص، احمد بن علی ابوبکر، احکام القرآن (تحقیق: محمد صادق القمحاوی) دار احیاء التراث العربی بیروت، ج: ۱،ص: ۱۵۳۔(۱۷) ابوزہرہ، اصول الفقہ، دار الفکر قاہرہ، ۱۹۹۷ء،ص: ۲۶۹۔(۱۸) قرآن، مائدہ: ۴۵۔(۱۹) رازی، الجصاص، احمد بن علی ابوبکر، احکام القرآن (تحقیق: محمد صادق القمحاوی) دار احیاء التراث العربی بیروت، ج: ۱،ص: ۱۷۴۔(۲۰) ایضاً، ج: ۵،ص: ۹۵۔(۲۱) قرآن، مائدہ: ۳۳۔(۲۲) رازی، الجصاص، احمد بن علی ابوبکر، احکام القرآن (تحقیق: عبدالسلام محمد علی شاہین)، دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان، طبع اول ۱۴۹۴ء،

ج:۲،ص،۵۱۰۔(۲۳)قرآن،نساء:۶۵۔(۲۴)شافعی محمد بن ادریس،احکام القرآن،(جمع وترتیب:احمد بن حسن ابوبکر بیہقی) مکتبہ الخانجی قاہرہ،طبع دوم م ۱۹۹۴ء،ج:۱،ص:۳۰۔(۲۵)ایضاً،ج:۱،ص:۷۴۔(۲۶)قرآن، بقرہ:۱۹۶۔(۲۷)رازی،الجصاص،احمد بن علی ابوبکر،احکام القرآن(تحقیق:محمد صادق القمحاوی)دار احیاء التراث العربی بیروت، ج:۱،ص:۱۳۰۔(۲۸)رازی،فخرالدین،محمد بن عمر بن حسن،المحصول(دراسہ وتحقیق:ڈاکٹر طہٰ جابر العلوانی) مئوسسۃ الرسالہ طبع سوم ۱۹۹۷ء ج:۳،ص:۱۲۶۔(۲۹)قرآن، مائدہ:۶۔(۳۰)الشافعی محمد بن ادریس،احکام القرآن(جمع وترتیب:احمد بن حسن ابوبکر بیہقی) مکتبہ خانجی قاہرہ ۱۹۹۴ء،ج:۱،ص:۴۶۔(۳۱)قرآن، مائدہ:۹۵۔(۳۲)الشافعی محمد بن ادریس،احکام القرآن(جمع وترتیب:احمد بن حسن ابوبکر بیہقی) مکتبہ خانجی قاہرہ، طبع دوم،م۱۹۹۴ء، ج:۱،ص:۱۲۱۔(۳۳)ایضاً، ج:۱،ص:۴۳۔(۳۴)ایضاً، ج:۱،ص:۱۱۴۔(۳۵)قرآن، نساء:۴۳۔(۳۶)الشافعی محمد بن ادریس،احکام القرآن(جمع وترتیب:احمد بن حسن ابوبکر بیہقی) مکتبہ خانجی قاہرہ، طبع دوم ،م۱۹۹۴ء، ج:۱،ص:۷۴۔(۳۷)قرآن، مجادلہ:۳۔(۳۸)ایضاً،نساء:۹۲۔(۳۹)الشافعی محمد بن ادریس، احکام القرآن(جمع وترتیب:احمد بن حسن ابوبکر بیہقی) مکتبہ خانجی قاہرہ، طبع دوم ،م۱۹۹۴ء، ج:۱،ص:۲۳۶۔ (۴۰)ایضاً،ج:۱،ص:۱۰۶۔(۴۱)قرآن،نساء:۱۱۔(۴۲)الشافعی محمد بن ادریس،الرسالہ(تحقیق:احمد شاکر) مکتبہ حلبی مصر،ص:۶۶۔(۴۳)قرآن،مائدہ:۶۔(۴۴)الشافعی محمد بن ادریس،احکام القرآن(جمع وترتیب:احمد بن حسن ابوبکر بیہقی) مکتبہ خانجی قاہرہ،طبع دوم،م۱۹۹۴ء،ج:۱،ص:۴۴۔(۴۵)ایضاً،ج:۱،ص:۸۲۔(۴۶)قرآن، بقرہ:۱۹۸۔(۴۷)ایضاً،نور:۶۱۔(۴۸)ایضاً،نور:۶۰۔(۴۹)ایضاً،نساء:۱۰۱۔(۵۰)الشافعی محمد بن ادریس، احکام القرآن(جمع وترتیب:احمد بن حسن ابوبکر بیہقی) مکتبہ خانجی قاہرہ،طبع دوم،م۱۹۹۴ء،ج:۱،ص:۹۱۔

اخبار علمیہ

''ننھی خطاطہ ریمان عسیری کا خواب''

خطاطی کا فن موبائل اور کمپیوٹر کے سبب معدوم ہوتا جارہا ہے۔اس جانب ماہرین کی توجہ بھی بالعموم کم ہوتی جارہی ہے۔ایسے میں سعودی عرب کی ایک گیارہ سالہ خطاطہ ریمان عسیری کی عربی رسم الخط میں غیر معمولی مہارت قابل دید وتذکرہ ہے۔ایک خبر کے مطابق اس ننھی خطاطہ کے تیار کردہ نمونے بڑے بڑے خطاطوں کی تیار کردہ پینٹنگز کی صف میں شامل کیے جارہے ہیں اوراس نے سعودی عرب کی سطح پر متعدد ایسے پروگراموں میں اپنی تیار کردہ پینٹنگز پیش کی اور ماہرین نے اس کو داد وتحسین سے نوازا۔اس کا بیان ہے کہ خطاطی کا شوق اسے اپنے اسکول کے دوران پیدا ہوا۔اپنا شوق پورا کرنے کے لیے عربی خطاطی کی مختلف تعلیمی وتدریسی ویڈیوز سے بھی مدد لی۔اس کے علاوہ مشہور سعودی خطاط سراج العمری اور خطاطہ خلود نائف نے بھی اس کی مدد اور رہنمائی کی،عربی رسم الخط میں فاطمی رسم الخط اسے زیادہ پسند ہے اوراس میں وہ مقام انفرادیت پر فائز ہونے کی خواہش مند ہے۔گھر میں زیادہ وقت خطاطی کے فن کو مزید بہتر بنانے اوراسے جلا بخشنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ غلافِ کعبہ پر ہونے والی خطاطی میں شمولیت اس کا خواب ہے۔اسے یقین ہے کہ اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔اس نے فن خطاطی کے اپنے تیار کردہ نمونے ابہا اور لیا لیتا میں ہونے والے میلے اور وادی الدوامر میں منعقدہ قومی پروگراموں میں پیش کیے ہیں۔(سیاست حیدرآباد،ص۹، ۱۷/۷/۲۰۲۰ء)

''روزنامہ روشنی کی انوکھی پہل''

۷۸ سالہ قدیم اردو روزنامہ ''روشنی'' کشمیر کے ایک شمارے کے صفحہ اول پر فیس ماسک کو چسپاں کیا ہے اور نچلے حصے پر اس کے استعمال کی اہمیت وضرورت پر اداریہ رقم کر کے ایک انوکھی اور مثالی مہم کا آغاز کیا ہے۔فیس ماسک اخبار کے قارئین کو مفت فراہم کیا گیا ہے اور دائیں جانب لکھا ہے ''ماسک کا استعمال ضروری ہے۔اس سے نہ صرف آپ بلکہ آس پاس رہنے والے لوگ بھی کورونا وائرس سے بچ سکتے ہیں''۔ ''روشنی'' کی قیمت آج بھی صرف دو روپے ہے۔شمارے کا آخری صفحہ کورونا سے متعلق واقفیت کے نام وقف ہے۔اس صفحہ کے بالائی حصہ پر اس وائرس سے پیدا شدہ صورت حال کی چند تصاویر ہیں اور نچلے حصہ پر محکمۂ اطلاعات وتعلقات عامہ کا کرونا کے بارے میں اشتہار ہے۔آخری صفحہ پر ارباب حل وعقد اور صاحبانِ اقتدار کے وہ بیانات ہیں جن میں عوام الناس کو فیس ماسک لگانے کی تاکید کی گئی ہے۔اداریہ میں

لکھا گیا ہے ''کرونا وائرس کی وجہ سے ہزاروں لوگ (اب یہ تعداد لاکھوں میں پہنچ چکی ہے) اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اتنا ہی نہیں اس وبا نے ہمارے اقتصادی حالات کو بھی متاثر کیا ہے۔ کشمیر جو گذشتہ سال زیادہ مشکلات اور لاک ڈاؤن سے دوچار ہے مزید مشکلات میں مبتلا ہے۔ یہ وقت نون میں نقطہ نکالنے کا نہیں رہا بلکہ جو مسائل درپیش ہیں ان کا مل جل کر ازالہ کرنے کی ضرورت ہے''۔ اداریہ میں اس وبا کے تئیں ڈاکٹروں کے کردار کے متعلق کہا گیا ہے کہ ''ڈاکٹر حضرات ہمارا ایک سرمایہ ہیں۔ ان کی انتھک کوشش سے ہی بیماروں کی جانیں بچائی جاسکتی ہیں''۔ (سیاست حیدرآباد، ص ۳، ۱۲ جولائی ۲۰۲۰ء)

''او، آئی، ایس کے سکریٹری کی اپیل''

آرگنائزیشن آف اسلامک کنٹریز (او، آئی، ایس) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر یوسف بن احمد العثمین نے غیر مسلم ممالک میں سکونت پذیر مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے معاشرہ میں انضمام کی صورت حال کو بہتر بنائیں، باہم مل جل کر رہنے کا ماحول اپنائیں۔ اپنے رہائشی ممالک کے قوانین کی مکمل پاسداری کریں، کسی بھی قسم کی پریشانی کے حل کے لیے پرامن راستہ اپنائیں اور اس کے لیے سرکاری اور قانونی طریقوں پر عمل پیرا رہیں۔ انہوں نے یو، این، اے کے آن لائن میڈیا فورم پر مسلمانوں سے پرزور انداز میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ سائنس وٹکنالوجی اور تہذیب وثقافت کی ترقی میں حصہ لیں۔ جن غیر مسلم ملکوں میں آپ رہ رہے ہیں وہاں کے اچھے شہری بنیں۔ اپنے آپ کو معاشرہ سے الگ نہ سمجھیں، دوسروں پر اپنے عقائد یا رائے مسلط کرنے کے رجحان سے بچیں۔ اس دوران سعودی عرب نے اقوام متحدہ کے ذیلی انسانی حقوق کے ادارے سے مطالبہ کیا ہے کہ اسلاموفوبیا کے خاتمہ کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔ اسلاموفوبیا تعصب، نسل اور تفریق کی نئی شکل ہے۔ جینوا میں اقوام متحدہ کے ماتحت سعودی سفارتی مشن سے متعلق ادارہ انسانی حقوق کے سربراہ مشعل البلوی نے انسانی حقوق کونسل سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ انٹرنیٹ اغیار کے خلاف نفرت، نسلی تفریق اور امتیاز کو ترویج دینے والا کھلا میدان بنا ہوا ہے۔ اس پر قدغن لگانے کی سخت ضرورت ہے''۔ (اعتماد، حیدرآباد، ۱۸/۷/۲۰۲۰ء)

''ای لرننگ انیمیشن سافٹ ویر کا اجرا''

اول تا دہم طلبہ کی تعلیمی سہولت کے لیے ''ای لرننگ انیمیشن سافٹ ویر'' کے نام سے ملک میں پہلی بار اردو سافٹ ویر متعارف کرایا گیا ہے جو ٹیب موبائل پر بھی دستیاب ہے۔ یہ سافٹ ویر مؤثر تدریس کے لیے

پن ڈرائیو میں بھی موجود ہے۔اس سے ریاست مہاراشٹر کے تمام اسکول طلبہ کی تعلیمی وفکری آگہی میں جلا پیدا کر سکتے ہیں، ملکی سطح کے مقابلہ جاتی امتحانات میں شرکت کے قابل بنا سکتے ہیں۔اس کے علاوہ اس سے نصابی و درسی کتابوں کے ساتھ طلبہ کے اندر تکنیکی واختراعی سمجھ بھی پیدا ہوگی۔مثبت رویہ، باہمی اعتماد، تعلیم و وطنیت سے دلچسپی اور سخت محنت کا جذبہ بھی پروان چڑھے گا اور سب سے بڑھ کر اس میں وقت کی بچت ہوگی۔اس سافٹ ویر کا اجرا ڈاکٹر پی،اے انعامدار شیخ کامل ریاض کے ہاتھوں ہوا۔(ممبئی اردو نیوز،ص۶، ۲۲/۷/۲۰۲۰ء)

''روبوٹ کیمیا داں سائنس داں''

یونیورسٹی آف لیور پول کے ماہرین نے روبوٹ کیمیا داں تیار کیا ہے جو ایک ہفتہ میں سینکڑوں تجربات انجام دے سکتا ہے۔برطانوی سائنس دانوں نے لیباریٹری میں کام کرنے والے ایک روبوٹک بازو کو معمولی سی تبدیلی اور پروگرامنگ سے گذارنے کے بعد کیمیائی تجربہ گاہ میں استعمال کیا تو اس نے مہینوں کا کام تین دنوں میں مکمل کر دکھایا۔اس کی قیمت اگرچہ ایک لاکھ پونڈ ہے مگر یہ انتہائی مہارت سے کیمیا کے پیچیدہ ترین تجربات انجام دے سکتا ہے۔یہ ۲۱ گھنٹے مسلسل کام کر سکتا ہے۔صرف چارجنگ کے دوران آرام کرتا ہے۔یہ تجربہ گاہ میں کسی شئ سے ٹکرائے بغیر گھوم پھر سکتا ہے۔ابتدائی آزمائش میں اس نے ایک ہفتہ میں سات سو انتہائی اہم تجربات انجام دیے۔اتنے تجربات ایک پی ایچ۔ڈی طالب علم اپنے پورے عرصۂ ڈاکٹریٹ میں بھی نہیں کر پاتا۔ماہرین نے اس کی پروگرامنگ کر کے اسے مددگار کے بجائے خود سائنس داں بنا ڈالا۔چار سو کلوگرام وزنی اس روبوٹ سائنس داں نے انسانی ماہرین کی رہنمائی میں ایک عمل انگیز بھی دریافت کیا جو شمسی سیلوں کی افادیت بڑھا سکتا ہے۔ساتھ ہی اپنے افعال سے سیکھتا اور اپنے کام کو بہتر بنانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔یہ روبوٹ اندھیرے میں بھی کام کر سکتا ہے کیونکہ کیمیا کے بعض تجربات بہت حساس ہوتے ہیں اور روشنی ان میں خلل ڈال سکتی ہے۔بایں لحاظ اس کی افادیت انسانوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔اسے جامعہ کے ماہر ڈاکٹر بنجامن برگر نے تیار کیا ہے۔اگرچہ اس روبوٹ نے بعض غلطیاں بھی کی ہیں تاہم انسانوں کے بالمقابل ان کی شرح بہت کم ہے۔خاص بات یہ ہے کہ یہ اپنی غلطیوں سے سیکھتا ہے اور مزید بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔اسی وجہ سے اسے کرونا وائرس سے بھرپور ماحول میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔یہ چیزوں کو وزن کر سکتا ہے۔مائع کشید کر سکتا ہے، برتن سے ہوا نکال کر باہر کر سکتا ہے اور مختلف طرح کے ردعمل بھی دے سکتا ہے۔اس کو دور دراز مرکز سے بھی چلایا جا سکتا ہے۔یہ پوری تحقیق جریدہ ''نیچر'' میں شائع ہوئی ہے۔

(تاثیر،اردو روزنامہ، پٹنہ،۱۶/جولائی ۲۰۲۰ء،ص۷) (ک۔ص۔اصلاحی)

معارف کی ڈاک

مکتوب بہار

مکرمی!............ السلام علیکم

معارف کے جولائی کے شمارہ میں محترمی اجمل ایوب اصلاحی صاحب کا استدراک نظر سے گزرا، ان کی رہنمائی واصلاح کا سراپا ممنون ہوں، واقعتاً ان اغلاط کی طرف توجہ نہیں ہوسکی تھی، بڑوں کی طرف سے نوآموزوں کی توجیہ ورہنمائی کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ موصوف نے براؤن کے فارسی خط کی اشاعت کے بارے میں ذکر کیا ہے، اس سلسلہ میں عرض ہے کہ خود سید صاحب نے اپنے دورِ ادارت میں اسی وقت معارف میں وہ مکتوب شائع کردیا تھا، بعد میں ماہنامہ فاران کراچی میں بھی اس کی اشاعت ہوئی، اس لیے اب تکرار اشاعت سے کوئی فائدہ نہیں۔ عربی مکاتیب جو آنجناب کی تمہید کے ساتھ یا راقم کے ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئے ہیں وہ اب تک میرے علم میں غیر مطبوعہ تھے۔ دارالمصنّفین میں سید صاحب کے نام ہندوستانی ممتاز اہل علم کے علاوہ عرب ومستشرق فضلاء، علامہ رشید رضا، عمر رضا، محب الدین خطیب، مارگولیتھ اور ان جیسے بہت سے نامور اہل علم کے مکاتیب محفوظ ہیں، کاش کہ ان کی طرف توجہ ہو، پہلا مرحلہ تو جدید معیار کے مطابق ان کے تحفظ کا ہے، ابھی یہ خطوط پرانی فائلوں میں محفوظ ہیں، نیز ان کو اس طرح اوراق سے چسپاں کیا گیا ہے کہ ایک طرف سے استفادہ کیا جائے تو دوسری طرف کا حصہ متاثر ہونے لگتا ہے، ضرورت ہے ان کو لمینیشن کرا کے البموں میں اچھی طرح محفوظ کیا جائے تاکہ کوئی بھی شخص ان سے جس وقت چاہے استفادہ کرسکے اور ان پر کچھ اثر نہ پڑے، دوسرا مرحلہ ان مکاتیب کی ترتیب وتحقیق کا ہے۔

اسی شمارہ میں دیسنہ لائبریری پر بھی مضمون نظر سے گذرا، یہ مضمون دیگر سوشل میڈیا پر وائرل ہوا ہے، اس سلسلہ میں بھی کچھ گذارشات پیش خدمت ہیں۔ دیسنہ اور استھاواں دو متصل بستیاں ہیں جیسے ایک شہر کے دو ملے ہوئے محلے، اور راقم کی تعبیر میں دو جڑواں بہنیں، دونوں کی روایات وثقافتی اقدار بھی یکساں ہیں، دیسنہ میں الاصلاح اور استھاواں میں الفلاح کے نام سے وہاں کی علمی وثقافتی انجمن بہت فعال اور سرگرم تھی اور دونوں جگہ ان کے ماتحت علمی نادر کتب خانہ بھی تھا، یہ الگ بات ہے کہ دیسنہ کے کتب خانہ کو جتنی شہرت حاصل ہوئی، استھاواں کا کتب خانہ اسی قدر گمنام رہا، دیسنہ کے کتب خانہ الاصلاح کی شہرت اس کے بلند مرتبت سپوتوں کی رہین منت ہے، اس مضمون سے قبل تیس چالیس کی دہائی میں بھی رباعیات عمر خیام کے نادر نسخہ کی وجہ سے اس کی شہرت یورپ میں ہوئی تھی اور لندن کے کسی علمی مجلہ میں اس حوالہ سے اس کا ذکر آیا تھا، سید صاحب نے اپنی کتاب خیام میں اس نادر نسخہ کو شامل کرکے اس کی شہرت میں مزید اضافہ کیا۔

سید صاحب نے اپنے ایک دوسرے مضمون میں بھی اس کا ذکر کیا ہے جو ان کی کتاب نقوش سلیمانی میں شامل ہے، پھر عبدالقوی دسنوی نے ایک اور مشرقی کتب خانہ کے عنوان سے اس پر پورا رسالہ ہی مرتب کر دیا ہے۔ سید صاحب نے اپنے محولہ بالا مضمون میں ۱۹۳۵ء میں لکھا تھا کہ ان کے علم میں باضابطہ اردو کا کوئی کتب خانہ نہیں، سب سے پہلا باضابطہ اردو کا کتب خانہ ان کے وطن کا کتب خانہ ہے، لیکن دیسنہ کا کتب خانہ ۱۸۹۹ء کا قائم کردہ ہے، جب کہ استھاواں کا کتب خانہ (جس کی عمارت پر آج بھی اردو لائبریری لکھا ہے) ۱۸۸۵ء میں قائم ہوا ہے، لیکن شاید سید صاحب کو اس کا علم نہیں ہوسکا، ۱۹۳۰ء میں یہاں کے ریکارڈ کے مطابق پانچ ہزار کتابیں تھیں، راقم نے اس کے کتب خانہ کے تعارف میں مفصل مضمون لکھا تھا جو خدابخش لائبریری جرنل میں ابھی چند ماہ پہلے ہی شائع ہوا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی، بابائے اردو مولوی عبدالحق اور سر راس مسعود جیسی شخصیات دیسنہ کے ساتھ اس کتب خانہ میں بھی تشریف لا چکی ہیں، یہاں قدیم مطبوعات و مخطوطات کا بڑا نادر ذخیرہ تھا، دارالمصنّفین، دارالترجمہ حیدرآباد اور دیگر اداروں کی مکمل تصانیف یہاں موجود تھیں، افسوس کہ ان کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا، اس کتب خانہ کو بھی خدابخش لائبریری میں منتقل کرنے کا مطالبہ تھا لیکن اہل وطن نے اسے قبول نہیں کیا، جو کچھ سرمایہ بچ گیا ہے وہ بھی بہت قابل قدر ہے، علامہ شبلی کی بعض تصانیف کے متعدد قدیم ایڈیشن اب بھی موجود ہیں۔

اس شمارہ میں علامہ شبلی اور تصوف کے حوالہ سے ڈاکٹر الیاس اعظمی کا مضمون بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس سلسلہ میں اپنی ایک اطلاع کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ چند ماہ قبل اس علاقہ کی مشہور خانقاہ اشرف پور کچھوچھہ (اکبر پور) میں حکومت کے ادارۂ مخطوطات کی طرف سے ایک ورکشاپ کا انعقاد ہوا تھا جس میں شرکت اور استفادہ کا موقع ملا، دوران قیام صاحب سجادہ جناب محمود اشرف صاحب سے بھی شرکاء کی ملاقات ہوئی، انہوں نے دوران گفتگو اپنے نادر کتب خانہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے جدامجد سابق سجادہ نشین خانقاہ کے روزنامچے کئی جلدوں میں محفوظ ہیں، جن میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے والوں کا ذکر ہے، پھر انہوں نے خدابخش خاں اور علامہ شبلی کی جوانی میں یہاں کثرت سے آمد و حاضری اور طویل قیام کا ذکر فرمایا اور بتایا کہ اس مفصل روزنامچہ میں جابجا علامہ شبلی کا تذکرہ موجود ہے۔ اگر وہ تمام متعلقہ تحریریں مرتب ہوکر منظر عام پر آسکیں تو علامہ شبلی کی کتاب زندگی کا ایک نیا باب سامنے آئے گا۔ راقم نے سوچا تھا لیکن برقت اس کا موقع نہیں مل سکا، محترم الیاس اعظمی صاحب وہاں سے قریب بھی ہیں، اور اس کام کے زیادہ اہل بھی۔

والسلام

(مولانا) **طلحہ نعمت ندوی**

ادبیات

نعتیہ غزل

جناب زاہد جعفری

نعتِ پیمبرؐ لکھنے والو! ''حرفِ تمت'' کون لکھے گا؟ جیسی ہے قرآن کے اندر، ویسی سیرت کون لکھے گا؟

آویزاں دیوار پہ کرلے دنیا زریں تحریریں انا اعطیناك الکوثر جیسی عبارت کون لکھے گا؟

عشق کی منزل جانے تو جانے حسن کُن اور لوح و قلم لیلۃ الاسریٰ جتنی مکمل شان نبوت کون لکھے گا؟

مزمّلؐ مدّثرؐ، طٰہٰؐ، ناطقؐ، صادقؐ، نور امیںؐ ندرت اسماء، رازِ طہارت، حدّ برکت کون لکھے گا؟

گلشن جنت، ساغر کوثر، کلمہ طیب، کعبہ، نماز اپنے غلاموں کی قسمت میں اتنی دولت کون لکھے گا؟

کوڑے پھینکو! خار بچھاؤ! پتھر مارو! ایذا دو بیمارِ عصیاں کا لیکن نسخۂ رحمت کون لکھے گا؟

سر رکھ دو نعلین نبیؐ پر! ایسے جیسے خاک عرب ورنہ ''دستاویز شفاعت'' روز قیامت کون لکھے گا؟

کردارِ اصحاب پیمبرؐ! چاند ہیں سب بے عقرب کے ان کی عقیدت ان کی رفاقت ان کی فضیلت کون لکھے گا؟

میری آنکھیں پوچھ رہی ہیں! بولو فرشتو! لب کھولو! یاد نبیؐ کے ''بے چارے آنسو'' کی قیمت کون لکھے گا؟

میرے اشکو! سجدے کرلو! ''عشق نبیؐ کی مسجد'' میں ان رونے والوں کے حق میں ورنہ جنت کون لکھے گا؟

یا شمس نظرت الی لیلی! یا برد دجیٰ یا نور ازل! تیرے سوا کالی پتلی پر ''صبح زیارت'' کون لکھے گا؟

کرب و بلا شبیر سے بولی، جان نبیؐ! آجا ورنہ تیرے علاوہ خون سے اب قرآن شہادت کون لکھے گا؟

القلب شجو الھم شجون من بے بس و بے بس ہیچ آقا! تیرے زاہد کی رودادِ عقیدت کون لکھے گا؟

جعفری باغ، جلال پور، فیض آباد (یو، پی)۔

اے وادیٔ لولاب!

جناب محمد عامر حیات حسینی

یک نغمۂ مرغانِ سحر خیز و جہاں تاب
کم خواب و دلآویز و عطر بیز و جہاں تاب
ای وادی لولاب

اے رمز کوہستان و بدخشان دلآویز
اے ساز طلسمات و جہاں خانۂ رنگ ریز
اے وادی گل پوش و صنم خانۂ تبریز
اے جادۂ افسانہ گراں نقش جہاں خیز
کم خواب و دلآویز و جہاں ساز و جہاں تاب
ای وادی لولاب

یک نقش کہن ساحل افسانۂ امروز
یک رقص ملا معنیٔ افسوں جہاں سوز
اے دست قضا تابش خم خانۂ فردا
یک دست صبا حامل افسانۂ فردا
کم خواب و دلآویز و دل آرام و جہاں تاب
ای وادی لولاب

یک لرزش پیمانۂ اقبال جہاں خیز
یک نغمۂ جانان ستم خیز و دل آویز
از رقص ستم کیش و ستم گار گل تر
از عکس نواخیز، انا، آب صنوبر
کم خواب و دلآویز و عطر بیز و جہاں تاب
ای وادی لولاب

پروفیسر شعبۂ فلاسفی، اے، ایم، یو، علی گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

نعت، مرثیہ اور عرفان (ایک علمیاتی بحث) از پروفیسر حیات عامر حسینی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۲۴، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔

فلسفی مصنف کی یہ کتاب نعت اور مرثیہ کے لحاظ سے گویا دوتہائی ادبی ہے اور عرفان وعصری آگہی کی شمولیت سے اس کا ایک تہائی حصہ فلسفیانہ کہا جاسکتا ہے، ابتدائیہ گو عنوان کے لحاظ سے اس کتاب کا حصہ نہیں مگر وہ بھی کسی بھرپور مضمون سے کم نہیں، اردو میں اس وقت فلسفیانہ مباحث کی وہ کثرت یا اہمیت نہیں جس کا مشاہدہ گذشتہ صدی میں عام نہ ہوتے ہوئے بھی نایاب نہ تھا، فلسفہ یوں بھی ہمیشہ عام لوگوں کے لیے وہ معمہ رہا جس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے خاص دماغ اور خاص ماحول درکار رہا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فلسفہ وہ دریائے دانش ہے جس میں ڈوب جانے کی تمنا بھی رہتی ہے، اس کتاب کو پڑھ کر کچھ اسی قسم کا احساس ہوتا ہے، ابتدائیہ کا پہلا صفحہ ہے، بات فن اور شاعری سے شروع ہوتی ہے، جملہ سامنے آتا ہے کہ ''الفاظ وبیان کی چستی، برجستگی اور شگفتگی اور بیان میں اختصار اچھی شاعری کی پہچان ہے''، اس کے بعد فوراً یہ جملہ اپنے اصل کی جانب اشارہ کرتا نظر آتا ہے کہ ''اختصار ذکاوت اور دانائی کی روح ہے''، بات آگے بڑھتی ہے تو فلسفی پوری طرح بیدار ہوجاتا ہے اور خیالات کی دنیا میں فلسفہ کی حکمرانی اپنا جلوہ دکھانے لگتی ہے کہ ''مذہبیت وروحانیت، دینیات سے کلی طور پر ایک الگ شے ہے جو ایک لگا بندھا منطقی نظام ہے اور جس کی حیثیت محض خارجی ہے......فن کا تعلق مذہبیت وروحانیت سے ہے، دینیات سے نہیں اور جب فن دینیات سے وابستہ ہوجاتا ہے تو وہ مناظرہ، پروپیگنڈہ یا منظوم کلام بن جاتا ہے، فن یا شاعری نہیں بنتا''، فلسفیانہ لہجہ کی یہی تو خوبی ہے کہ بات چاہے مشکل سے سمجھ میں آئے لیکن لطف بڑی آسانی سے مل جاتا ہے، فلسفی کی ایک خوبی اس کی خوداعتمادی بھی ہوتی ہے، وہ بڑے یقین سے کہہ سکتا ہے کہ ''لطیف شاعری غزل، نعت اور مرثیہ ہی میں ممکن ہے''، ''نری نظم گوئی جیسے قصائد ومثنوی کو اس میں شامل کرنے پر مجھے تردد ہے''، اب اس تردد کو اہل نظر کس نظر سے دیکھتے ہیں یہ وہ ہی جانیں۔ ہم کو اس احساس میں قطعی شبہہ نہیں کہ ''نعت ومرثیہ کا پہلا تقاضہ ہی حضور اکرمؐ اور آپؐ کے اہل بیت اطہار سے بے پناہ محبت، قلب ونظر کی وابستگی ووارفتگی اور دل ونگاہ کی پاکیزگی، کشادگی ووسعت اور عشق ومحبت سے ہے''، ''آپؐ کی ذات گرامی سے محبت، انسانوں کو خدا، کائنات اور انسانوں سے جوڑتی اور اسے اپنی روحانی، مابعدالطبیعاتی، مذہبی، سماجی اور اخلاقی حدود کے روبرو کرتی ہے''، ابتدائیہ کے یہ خیالات عشق وعقل یا پھر ادب وفلسفہ کے

امتزاج سے قبول اثر کی وہ کیفیت پیدا کرتے ہیں جو مطالعہ کا ہی نہیں مصنف کے مباحثہ کا بھی حاصل ہے۔ فلسفہ جب نقد ونظر کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس میں بھی تحیر کے مقامات مزہ دے جاتے ہیں، مصنف کو حالی و شبلی کی شعریاتی نظر لاجواب دکھائی دیتی ہے، شعرالعجم کو وہ عالمی ادب میں منفرد مقام دیتے ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ مرثیہ کی شعریات کے حوالہ سے اردو میں کوئی کام نہیں ہوا، جو ہوا وہ روایتی طور پر مرثیہ، تاریخ اور مراثی کے مضامین کے لیے خاص رہا، فلسفی نقاد کو کہنے کا حق ہے کہ ان مضامین کی فلسفہ ونظریات شعر میں کوئی اہمیت نہیں، اس لیے بقول مصنف شعریات اور معنویات کے نئے مفکرین کی تلاش اب ایک مسئلہ ہے اور بھی مزے کی باتیں ہیں، صرف مزہ کی نہیں غور وفکر کی بھی کہ معدودے چند افراد کے اردو میں کوئی بڑا مفکر نقاد پیدا ہی نہیں ہوا اور اس پر تماشا یہ کہ عربی زبان وادب جو نئے معانی اور جہتیں عطا کر سکتا تھا اور ہے، اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور یہ جملہ بھی کیا خوب ہے کہ ہمارے علمائے عربی وفارسی ابھی تک کلیلہ ودمنہ کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں، مرثیہ کی شعریات پر کئی المیے بیان کیے گئے جس میں یہ بھی ہے کہ ہندوستانی تہذیب جس کی بنیادیں شرک وکفر میں پیوستہ ہیں اور جس میں کسی واحد وصمد خدا، رسالت، معاد، عدل اور یوم آخرت کی جواب دہی کا کوئی ہلکا سا عنصر بھی نہیں، اس کو مرثیہ کی تہذیب سے ملا دیا گیا۔ عرفان کا ذکر رہ گیا، اس کا تعلق جمال سے بتایا گیا اور پھر اس میں فلسفہ والوں کی مسرت، حسن، خیر، جلال سب کا ذکر آ گیا اور اعتراف کیا گیا کہ یہ ایک نہایت پیچیدہ اور مختلف الجہات بحث ہے، افلاطون سے کروچے تک حوالے ہی حوالے ہیں اور کمال ہے کہ جمال کو عدل ثابت کر کے اس کو توحید سے جوڑ دیا گیا اور بڑی خوبی سے بتایا گیا کہ شرک کا خاصہ بے معنویت ہے کیونکہ یہ ہر عمل کو محض جسم اور سطحی لذتیت میں محدود کر دیتا ہے، مغرب کی بے معنویت، کھوکھلا پن اور وجودی انتشار اسی مشرکانہ نظام اقدار اور سوچ کی پیداوار ہے، اس کا فلسفہ اور اس کی سیاست، معیشت، جمالیات، اخلاقیات اور سماجی نظام اپنی تمام تر علمی، سائنسی اور تکنیکی ترقی کے باوجود اسی بے معنویت کا شکار ہے۔ تخیل کے باب میں یہ خیال ہے کہ ایک پیغمبر اور فن کار میں زمین وآسمان کا فرق ہے، پیغمبر حقیقت ابدی کو محض حسن یا محض صفت میں نہیں دیکھتا بلکہ اسے ایک ذات واحد کی حیثیت سے جو تمام صفات کی حامل ہے، دیکھتا ہے۔ یہ عرفان کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہوتا، اس کی نسبت سے دوسری تمام نسبتیں قائم ہوتی ہیں، کتاب میں ان لوگوں کے لیے بہت کچھ ہے جو ادب کی قدروں کو عقلی اور منطقی بنیادوں پر استوار دیکھنا چاہتے ہیں اور نظریات کو پیش کرنے اور اپنے دلائل کو قطعی بتانے کی ہمت کی داد دینے میں کسی عصبیت کا شکار نہیں ہوتے۔ (ع۔ص)

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں) علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	2200/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	300/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-
موازنہ انیس و دبیر	250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم ومصر وشام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی) مرتبہ: سید سلیمان ندوی	170/-
مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری) 〃	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print

MAY 2020 Vol - 205 (5)

RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP-43/022

Monthly Journal of

Darul Musannefin Shibli Academy

P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

۱۔	سیر الصحابہ اول	حاجی معین الدین ندوی	300/-
۲۔	سیرت عائشہؓ	مولانا سید سلیمان ندوی	220/-
۳۔	حیات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	650/-
۴۔	تذکرۃ الفقہاء اول	مولانا عمیر الصدیق ندوی	150/-
۵۔	مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
۶۔	حکیم الامت۔نقوش وتاثرات	مولانا عبدالماجد دریابادی	400/-
۷۔	علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	180/-
۸۔	تاریخ اسلام (اول و دوم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	370/-
۹۔	تاریخ اسلام (سوم و چہارم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	500/-
۱۰۔	تاریخ دولت عثمانیہ اول	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۱۔	تاریخ دولت عثمانیہ دوم	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۲۔	تاریخ ارض القرآن (اول و دوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	375/-
۱۳۔	تاریخ اندلس اول	سید ریاست علی ندوی	350/-
۱۴۔	تاریخ اندلس دوم	سید ریاست علی ندوی	220/-
۱۵۔	تاریخ اندلس سوم	سید ریاست علی ندوی	300/-
۱۶۔	مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت	محمد سعود عالم قاسمی	300/-
۱۷۔	عہد اورنگ زیب میں علما کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
۱۸۔	تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں	ظفر الاسلام اصلاحی	100/-
۱۹۔	آثارِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-